Regd. L. No. 7243
Phone, 808

قرآنی نظام ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

جنوری 1978

ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ بی گلبرگ لاہور

قیمت فی پرچہ : 2 روپے

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ

طلوعِ اسلام

لاہور

بدلِ اشتراک	ٹیلی فون ۸۰۸۰۰	قیمت فی پرچہ
سالانہ پاکستان ـــ ۲۴ روپے غیر ممالک ـــ ۳ پونڈ	خط و کتابت ناظم ادارۂ طلوعِ اسلام ـ ۲۵/بی، گلبرگ۲ لاہور	۲ دو روپے
جلد ۳۱	جنوری ۱۹۷۸ء	شمارہ ۱

فہرست

۱ ـ لمعات ۲

۲ ـ ایک مہیب خطرہ .. .. .. پاکستان میں سیکولر اسلام .. .. .. (پھر نہ کہنا ہمیں خبر نہ ہوئی!) ۹

۳ ـ حقائق و عبر .. .. (۱) جناب پرویز کے نقشِ قدم .... (۲) بدزبان سیاست ـ (۳) ہمیں علیحدہ وطن کیوں حاصل کرنا چاہئے؟ (۴) امیرِ جماعت کے اختیارات (۵) اسلام میں عورت کا مقام ـ (۶) اس کا کچھ انتظام کرنا ہوگا! (۷) ایک گمراہ کن باطل دلیل ـ (۸) قدم اوّل ہی غلط سمت کی طرف ـ ۲۱

۴ ـ ریکارڈ میں رکھئے .. .. (۱) مودودی صاحب ـ (۲) مفتی محمود صاحب اور نظریۂ پاکستان ـ (۳) مفتی صاحب اور سوشلزم (۴) مفتی صاحب اور رفتی کا مسئلہ (۵) قرآن ہمارا منشور ہے ـ (۶) نیشنل ڈیموکریٹک پارٹی اور نظامِ مصطفےٰ (۷) مودودی صاحب کا لٹریچر (۸) روس اور مولانا عبید اللہ انور ـ (۹) برطانیہ میں علمائے کرام کا ورود ـ (۱۰) اسلامی جمہوریۂ پاکستان کی عدالتیں (۱۱) ارشاداتِ قائدِ اعظم (۱۲) کمیونزم کا نسخہ (۱۳) ذو الفقار علی بھٹو نہ رادھا ناچے! (۱۴) صرف اللہ کا حکم نافذ! ۲۹

۵ ـ سجدۂ شکرانہ (بدرگاہِ رب العرش) .. .. .. محترمہ ثریا عندلیب ـ ۶۰

ایڈیٹر: محمد خلیل ـ ناشر: سراج الحق ـ مقامِ اشاعت: ۲۵/بی، گلبرگ ۲ لاہور ـ پرنٹر: شیخ نیاز احمد ـ مطبوعہ: علمی پرنٹنگ پریس، ۷ ہسپتال روڈ لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

جب تک ہمارے علماء نے سیاست میں حصہ نہیں لیا تھا وہ اپنے عقائد میں نہایت پختہ اور ان کے اظہار میں بڑے بے باک ہوتے تھے۔ وہ رسول اللہ کی طرف منسوب اس حدیث کو بڑی جرأت اور بیباکی سے پیش کیا کرتے تھے جس میں کہا گیا ہے کہ میری اُمت میں تہتّر (۷۳) فرقے ہوں گے۔ ان میں ایک فرقہ ناجی ہوگا اور باقی جہنمی۔ وہ نہایت فخر اور جرأت کے ساتھ اپنے فرقہ کو ناجی اور باقی فرقوں کو باطل قرار دیا کرتے تھے۔ اس باب میں مختلف فرقوں میں باہمی مناظرے اور مباحثے ہوتے اور کتابوں پر کتابیں لکھی جاتیں۔ انہیں کبھی اپنے آپ کو فرقہ قرار دینے میں نہ عار محسوس ہوتی نہ کسی قسم کی جھجک۔ اُمت میں ہزار برس سے یہی ہوتا چلا آرہا تھا اور اس موضوع پر اَلْفَرْقُ بَیْنَ الْفِرَقِ جیسی اہم تصانیف وجود میں آئی تھیں۔

لیکن ہمارے دور میں جب یہ حضرات سیاست کے میدان میں آئے تو، ایک تو خود عصرِ حاضر کی میکیاولی سیاست کا تقاضا تھا کہ کوئی متنازعہ فیہ بات دو ٹوک نہ کہی جائے۔ الفاظ میں ابہام رکھا جائے اور معاملات میں مداہنت برتی جائے۔ اس پر مودودی صاحب کا فتویٰ کہ "زندگی کی بعض ضرورتوں کے لئے جھوٹ بولنا واجب ہو جاتا ہے"۔ اس نے نہ صرف مداہنت بلکہ افترا اور دروغ گوئی کو مقدس بنا دیا۔ چنانچہ یہ روش ہمارے یہاں کی مذہبی سیاست کا عام چلن ہوگئی۔

دورِ حاضر میں پارٹی بازی کو سیاست کا جزوِ لاینفک قرار دیا جاتا ہے اور فرقہ داری (SECTARIANISM) کو انتہائی معیوب بلکہ مذموم۔ سیاست کے اس تقاضا کی رو سے ہمارے علماء بھی اپنے آپ کو فرقہ کہنے میں جھجک محسوس کرنے لگے اور سوچنے لگے کہ اس "لعنت" سے کس طرح چھٹکارا حاصل کیا جائے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے فرقہ پرستی کو شرک قرار دیا اور حضور نبی اکرمؐ سے فرمایا کہ جو لوگ دین میں فرقے پیدا کرلیں، ان سے آپ کو کوئی واسطہ نہیں۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان تنبیہات اور تنذیرات نے تو فرقہ پرستی کے خلاف نہ کوئی جھجک پیدا کی نہ عار؛ لیکن عصرِ حاضر کی سیاست کے تقاضا نے اس جذبے کو ابھارا۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ یہ حضرات اپنے تشخص کو بھی چھوڑنا نہیں چاہتے تھے۔ اس لئے مشکل یہ درپیش آئی کہ یہ، "گنج وارد مریز" کی روش کیسے نباہی جائے۔ اس مشکل کے حل کے لئے کسی نے ان کے کان میں یہ افسوں پھونکا کہ تم مکاتبِ فکر ہو، فرقے ہو ہی نہیں۔ اس عقدہ کشائی سے انہوں نے مسرت کے شادیانے بجائے

اور ہر ایک نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ اُمت میں فرقہ کوئی ہے ہی نہیں۔ یہ سب مکاتبِ فکر ہیں۔ ان میں سے کسی کو بھی اتنا خیال نہ آیا۔ اور اگر خیال آیا بھی تو اس کے اظہار کی جرأت نصیب نہ ہوئی کہ اگر امت میں کوئی فرقہ نہیں تو رسُول اللہ کی طرف منسوب اُس حدیث کے متعلق کیا کہا جائے گا جس میں حضورؐ نے اُمت میں تہتّر (۷۳) فرقوں کی پیش گوئی فرمائی تھی اس دعویٰ سے کہ امت میں کوئی فرقہ ہی نہیں خود ان کے عقیدہ کے مطابق رسُول اللہ کی (معاذ اللہ) تکذیب ہوتی ہے۔ لیکن انہیں اس کی کیا پرواہ ؟

پھر یہ بھی سوچئے کہ ان (نام نہاد) مکاتبِ فکر کے باہمی اختلاف کا یہ عالم ہے کہ ان کی مسجدیں، الگ الگ ہیں۔ یہ ایک دوسرے کے ساتھ مل کر نماز نہیں پڑھ سکتے۔ ان کی فقہیں الگ الگ ہیں۔ یہ ایک دوسرے کے خلاف نت نئے دن کفر کے فتوے صادر کرتے رہتے ہیں۔ ان سے پوچھئے کہ اگر یہ سب "فکری اختلافات" ہیں تو پھر عملی اختلاف کسے کہا جائے گا؟ فکری اختلاف مفکرین (فلاسفرز) میں ہوتا ہے لیکن وہ اس اختلاف کی بنا پر الگ الگ فرقے نہیں بناتے۔ ابنِ رُشد اور ابنِ سینا کو چھوڑیئے، کہ وہ پرانے زمانے کی بات ہے۔ خود ہمارے زمانے میں علامہ اقبالؒ عظیم مفکر گذرے ہیں۔ انہوں نے اپنی فکر کی بنیاد پر کوئی الگ فرقہ نہیں بنایا جسے مکتبِ فکرِ اقبالؒ کے نام سے موسوم کیا جا سکے!

آپ نے غور فرمایا کہ انہی علماء کے پیش رو، یعنی ان کے اساتذہ اور مرشدین جس فرقہ داری کو اس دھڑلّے سے پیش کرتے تھے، یہ حضرات اس کا نام تک لینے سے کس قدر شرماتے ہیں اور محض الفاظ کی تبدیلی سے اپنے آپ کو یا دنیا کو دھوکا دیتے ہیں کہ ہم میں فرقہ کوئی نہیں۔

حالیہ تحریک میں ان مختلف فرقوں نے محض سیاسی مقصد کے لئے باہمی اتحاد پیدا کیا۔ جب ان پر اعتراض ہوا کہ آپ لوگوں کے معتقدات اور مسالک میں اس قدر شدید اختلافات ہیں تو ان کی موجودگی میں آپ میں اتحاد کس طرح پیدا ہو سکتا ہے۔ تو انہوں نے جواب دیا کہ یہ اختلافات محض فروعی اور جزوی نوعیت کے ہیں — اصولی نہیں ہیں۔ اصولات میں ہم سب متفق ہیں۔ ہفت روزہ الاعتصام (لاہور) مسلکِ اہلِ حدیث کا داعی اور جماعتِ اہلِ حدیث کا ترجمان ہے۔ اس نے اپنی ۹ دسمبر ۱۹۷۷ء کی اشاعت میں روزنامہ جنگ کا ایک اداریہ تائیداً درج کیا ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ :-

> جو لوگ قومی اتحاد کے مخالف ہیں، اور ایسے عناصر جو نظامِ اسلامی کا راستہ روکنا چاہتے ہیں، ان کا سب سے خطرناک پروپیگنڈہ یہی ہے کہ اتحاد میں مختلف نظریات رکھنے والی جماعتیں ہیں اور ایسی دینی سیاسی جماعتیں بھی ہیں جن کے درمیان مذہبی امور کے بارے میں اختلافات پائے جاتے ہیں۔ اس لئے قومی اتحاد نہ کسی سیاسی نظام کو چلا سکے گا اور نہ نظامِ مصطفےٰؐ قائم کر سکے گا۔

ظاہر ہے کہ یہ ایک بے بنیاد اور معاندانہ پروپیگنڈہ ہے۔ مختلف مذہبی جماعتوں کے درمیان جو اختلافات پائے جاتے ہیں وہ فروعی اور جزوی نوعیت کے ہیں۔ وہ اپنے اپنے مسلک پر چلتے ہوئے ایک مشترکہ مقصد کے لئے مل کر جدوجہد کر سکتے ہیں۔ ان بنیادوں اور اصولوں کے لئے کام کر سکتے ہیں جن پر سب کا اتفاق ہے اور اسی اتفاق کی بنیاد پر وہ ملّتِ مسلمہ کا ایک جزو بنے ہوئے

ہیں اور اسی بنیاد پر ان کا یہ دعویٰ بھی ہے کہ فروعی اور فقہی اختلافات نظامِ مصطفےٰ کے قیام کی راہ میں رکاوٹ نہیں بن سکتے۔ (صفحہ ۶)

ہم چاہتے تو ایسے بیسیوں شواہد پیش کر دیتے جن سے واضح ہو جاتا کہ ان حضرات کے باہمی اختلافات کس قدر اصولی ہیں۔ لیکن عدم گنجائش کی بنا پر ہم یہاں صرف دو چار پر اکتفا کرتے ہیں۔

(۱) الاعتصام کا مندرجہ بالا اقتباس، اس کے صفحہ ۶ پر درج ہے اور صفحہ ۳ پر "سالِ اقبالؒ" کی تقاریب کے سلسلہ میں تحریر ہے کہ:-

قطعِ نظر اس بات کے کہ یہ یوم اور برسیاں منانا ہی اسلام کے خلاف ہیں، کئی قباحتیں اس میں دیکھنے میں آئیں۔ ایک تو یہ کہ علامہ اقبالؒ کی قدِ آدم تصویر بنا کر اس کی نقاب کشائی کی گئی۔ حالانکہ تصویر سازی اسلام میں حرام و ممنوع ہے اور اس سے بت پرستی کی راہ ہموار ہوتی ہے۔ دوسرے یہ کہ تمام مندوبین نے اور ان سے قبل خود جنرل ضیاء الحق صاحب نے قبرِ اقبالؒ پر پھولوں کی چادر چڑھائی حالانکہ قبروں پر چڑھاوا بھی مشرکانہ شعار اور جہنم میں لے جانے کا باعث ہے۔

ہم جماعتِ اہلِ حدیث سے بالعموم اور مؤقر جریدہ الاعتصام سے بالخصوص یہ دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ جو امور اسلام میں حرام ہیں اور جنہیں وہ مشرکانہ شعار اور جہنم میں لے جانے کا باعث قرار دیتا ہے، ان کا تعلق فروعات سے ہے یا اصولات سے؟ اگر اسلام کے فروعی احکام کی خلاف ورزی کا یہ نتیجہ ہے تو اصولی احکام کی خلاف ورزی کے نتیجے کو کن الفاظ سے پکارا جائے گا؟ "حرام، شرک اور باعثِ جہنم" اسلام میں ایسے امور ہیں جن کے ارتکاب سے انسان دائرۂ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے تو کیا یہ سب امور فروعی ہیں۔

(۲) جماعت اہلِ حدیث کے نزدیک احادیث پر ایمان مسلمان ہونے کی بنیادی شرط ہے۔ چنانچہ اس جماعت کے ایک سابقہ امیر مولانا اسمٰعیل (مرحوم) کا ارشاد ہے کہ:-

تحقیق و تثبیت کے بعد حدیث کا ٹھکانہ وہی مقام ہے جو قرآن عظیم کا ہے۔ اور فی الحقیقت اس کے انکار کا ایمان اور دیانت پر بالکل وہی اثر ہے جو قرآنِ عزیز کے انکار کا..... جو احادیث قواعدِ صحیحہ اور ائمہ سنت کی تصریحات کے مطابق صحیح ثابت ہوں ان کا انکار کفر ہوگا اور ملت سے خروج کے مرادف۔ (جماعتِ اسلامی کا نظریۂ حدیث۔ ص۴۸)

جو احادیث مندرجہ بالا معیار پر صحیح ثابت ہو چکی ہیں ان کے متعلق مولانا (مرحوم) فرماتے ہیں:-

بخاری اور مسلم کی احادیث کی صحت پر امت متفق ہے..... ان احادیث کی صحت قطعی ہے۔ (ایضاً۔ ص۵۵)

ان تصریحات سے واضح ہے کہ یہ بخاری اور مسلم کی کسی ایک حدیث کے انکار سے کفر لازم آ جاتا ہے۔ اور انکار کرنے والا ملت سے خارج ہو جاتا ہے۔ اب دیکھئے کہ مودودی صاحب کا اس باب میں کیا عقیدہ ہے

وہ فرماتے ہیں :-

یہ دعویٰ کرنا صحیح نہیں کہ بخاری میں جتنی احادیث درج ہیں ان کے مضامین کو بھی جوں کا توں بلا تنقید قبول کر لینا چاہیئے۔ (ترجمان القرآن بابت اکتوبر و نومبر ۱۹۵۲ء)

جہاں تک ان احادیث پر تنقید کا تعلق ہے مودودی صاحب کا مسلک یہ ہے کہ اس کا فیصلہ صرف "مزاج شناسِ رسول" کی نگاہ ہی کر سکتی ہے کہ کونسی حدیث صحیح ہے اور کونسی وضعی۔

مودودی صاحب کے اس مسلک کے متعلق مولانا اسمٰعیل مرحوم فرماتے ہیں :-

اگر ایک جماعت اپنی عقیدت مندی سے کسی اپنے بزرگ یا قائد کو خدا کا مزاج شناس سمجھ لے یا رسول کا مزاج شناس تصور کرلے پھر اسے اختیار دے دے کہ اصولِ محدثین کے خلاف جس حدیث کو چاہے قبول کرے جسے چاہے رد کر دے ...... تو یہ مضحکہ خیز پوزیشن ہمیں یقیناً ناگوار ہے۔ ہم انشاءاللہ آخری حد تک اس کی مزاحمت کریں گے اور سنتِ رسول کو ان ہوائی حملوں سے بچانے کی کوشش کریں گے۔ (جماعت اسلامی کا نظریۂ حدیث۔ صلا)

ہم جمعیۃ الاعتصام سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ اہلِ حدیث اور مودودی صاحب میں یہ اختلاف فروعی حیثیت کا ہے یا اصولی حیثیت کا؟ جس مسلک کی رو سے ایک شخص کافر قرار پاتا ہے اور ملتِ اسلامیہ کے دائرے سے خارج ہو جاتا ہے کیا اس کی حیثیت فروعی ہوگی؟

(۳) متحدہ محاذ میں ایک فرقہ بریلوی حضرات کا بھی شامل ہے۔ جمعیت العلمائے پاکستان ان کی پارٹی کا نام ہے اور مولانا نورانی اس کے سربراہ ہیں۔ بریلوی حضرات کے معتقدات کے متعلق تفصیلی گفتگو کے لئے صفوں کے صفحے درکار ہوں گے لیکن ہم ان میں سے صرف ایک عقیدہ کو پیش کرتے ہیں۔ اور وہ بھی جماعت اہلِ حدیث کے ایک دوسرے ماہنامہ "محدث" کے حوالہ سے۔ اس ماہنامہ کی شوال۔ ذیقعدہ ۱۳۹۷ھ کی اشاعت میں "نور و بشر" کے مشہور اختلاف کے سلسلہ میں "حدیثِ نور" کے عنوان سے ایک سوال کا جواب شائع ہوا ہے۔ اس میں بریلوی حضرات کا یہ عقیدہ بیان کرنے کے بعد کہ رسول اللہ، اللہ کے نور سے بنے تھے لکھا ہے :-

نور کا عقیدہ رکھنے والے دراصل محمد عربی (فداہ ابی و امی۔ صلعم) کی بعثت اور نبوت کی تکذیب کے سامان کر رہے ہیں ..... اللہ کے نور سے بننے کے معنی ہوئے کہ وہ خدا کا ٹکڑا ہے اور خدا کے حصے بخرے ہو سکتے ہیں۔ رسول کی فضیلت ثابت کرتے کرتے خدا کا بیڑا غرق کر ڈالا ہے۔ انا للہ۔ (صفحہ ۲۵)

بات "نور" ہی تک نہیں رہتی۔ بریلوی حضرات اس سے بہت آگے جاتے ہیں۔ رسول اللہ کے متعلق ان کا عقیدہ یہ ہے کہ

وہی لامکاں کے مکیں ہوئے، سرِ عرش تخت نشیں ہوئے!
وہ نبی ہے جس کے ہیں یہ مکاں وہ خدا ہے جس کا مکاں نہیں

(حدائق بخشش ۔ صلا ۔ بحوالہ کتابچہ "دعوت" شائع کردہ انجمن خدام توحید والسنۃ میانوالی۔ صلا)

اس سے بھی آگے بڑھئے قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کے متعلق ہے کہ :۔

هُوَ الْأَوَّلُ وَالْآخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ (۵۷/۳)

مولانا احمد رضا خان (مرحوم) کے صاحبزادہ مولانا حامد رضا خان، رسول اللہ کے متعلق فرماتے ہیں :۔

ہو الاوّل، ہو الآخر، ہو الظاہر، ہو الباطن
بکل شیئ علیم، لوح محفوظ خدا تم ہو!
نہ ہو سکتے ہیں دو اوّل، نہ ہو سکتے ہیں دو آخر
تم اوّل اور آخر۔ ابتدا تم۔ انتہا تم ہو

(حدائق بخشش ص۱ ۔ بحوالہ دھماکہ ص۳)

اس شعر میں ان حضرات کا یہ عقیدہ نہایت جامعیت سے سامنے آجاتا ہے کہ :۔

وہی جو مستوی عرش تھا خدا ہو کر
اتر پڑا وہ مدینہ میں مصطفےٰ ہو کر

(بحوالہ دھماکہ ص۳)

ہم جریدہ الاعتصام سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ آپ کے (بلکہ ان سب مذہبی جماعتوں کے بھی جو اتحاد میں شامل ہیں)۔ اعتقادات اور بریلوی فرقہ کے ان معتقدات میں فرق فروعی حیثیت کا ہے یا اصولی حیثیت کا؟ کیا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے متعلق آپ حضرات کا بھی یہی عقیدہ ہے۔ لگے ہاتھوں یہ بھی فرمایئے کہ ایسے عقائد رکھنے والوں کے متعلق آپ حضرات کا فیصلہ کیا ہے۔

ضمناً۔ بریلوی حضرات کے ان عقائد کی روشنی میں یہ حقیقت بآسانی سمجھ میں آسکتی ہے کہ انہوں نے "نظام خداوندی" کی جگہ "نظام مصطفےٰ" کی اصطلاح کیوں رائج کی ہے۔ اور تعجب بالائے تعجب یہ کہ حال ہی میں متحدہ محاذ کی کونسل میں مختلف نعروں میں مقابلہ کے بعد اسی نعرہ پر اتفاق کیا گیا ہے۔ ہم (فرقہ دیوبندی کے سربراہ) مفتی محمود صاحب اور جماعت اسلامی کے نمائندہ غفور احمد صاحب سے دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ بریلوی فرقہ کے ان عقائد کے متعلق جن کی بنا پر انہوں نے یہ نعرہ تجویز کیا ہے، ان کا فیصلہ کیا ہے؟

یہ ہے حقیقت ان حضرات کے اس دعویٰ کی کہ متحدہ محاذ میں شامل مذہبی جماعتوں کے اختلافات یونہی فروعی اور جزوی حیثیت کے ہیں۔ اصولی حیثیت کے نہیں۔ اصول پر سب متفق ہو سکتے ہیں۔

وہ اصول جس پر ان کے نزدیک یہ تمام جماعتیں متفق ہو سکتی ہیں یہ ہے کہ اگر اقتدار ان حضرات کے ہاتھ میں آگیا تو جمہوریہ اسلامیہ پاکستان میں پبلک لاز کس بنیاد پر مرتب کئے جائیں گے۔

ان حضرات کی طرف سے یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ ان قوانین کی بنیاد "کتاب و سنت" ہوگی۔ مودودی صاحب نے اس دعویٰ کی حقیقت ان الفاظ میں واشگاف کر دی کہ کتاب و سنت کی بنا پر پبلک لاز کا کوئی ایسا ضابطہ مرتب نہیں کیا جا سکتا جو شیعہ، حنفی، اہلحدیث کے نزدیک متفقہ طور پر اسلامی قرار

پا سکے۔ اس کے بعد انہوں نے تجویز کیا کہ فقہ حنفی کو پبلک لاز کے طور پر نافذ کر دیا جائے گا۔ اس کے خلاف اسی جریدہ الاعتصام نے ۲۵ دسمبر ۱۹۷۶ء کی اشاعت میں، ایک مفصل مقالہ شائع کیا جس میں اس تجویز کی بڑی سختی سے مخالفت کی گئی اور اپنی طرف سے یہ تجویز پیش کی کہ "تمام مکاتب فکر کو اجازت ہونی چاہیئے کہ وہ کھلے طور پر اپنی اپنی فقہ پر عمل کریں"۔

ہم جریدہ الاعتصام سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ جب آپ حضرات مملکت کے لئے ایک متفقہ اسلامی ضابطۂ قوانین بھی مرتب نہیں کر سکتے تو وہ کونسی اصولی بات ہے جس پر آپ متفق ہیں؟ نظامِ مصطفےٰ کو تو صرف ایک سلوگن کی حیثیت سے دہرایا جاتا ہے۔ اس کی عملی تعبیر تو اسلامی ضابطۂ قوانین کی شکل ہی میں سامنے آ سکتی ہے۔ اور جب آپ حضرات اس قسم کے ضابطہ کی تدوین کے سلسلہ میں متفق نہیں ہو سکتے، تو "نظامِ مصطفےٰ" کے نعرہ پر متفق ہونے کے معنی کیا ہیں؟

ہم ان حضرات سے باادب درخواست کریں گے کہ خدا کے لئے بات صاف اور سیدھی کیجئے۔ قوم کو مبہم اصطلاحات میں نہ الجھایئے۔ یہ معاملہ بڑا نازک اور بڑا اہم ہے۔ اس کا تعلق تو پاکستان کے مستقبل سے ہے۔

ان تصریحات سے (نیز جو کچھ گذشتہ کئی ماہ سے طلوعِ اسلام میں شائع ہو رہا ہے اور جسے ایک جامع مقالہ کی شکل میں اسی اشاعت میں پیش کیا جا رہا ہے) واضح ہے کہ پاکستان میں اسلامی نظام اس لئے قائم نہیں ہوا کہ یہ حضرات پبلک لاز کا کوئی متفق علیہ ضابطہ مرتب ہی نہیں کر سکتے — بجائے اس کے کہ یہ اس کا اعتراف کریں، یہ شروع سے یہ کوشش کرتے چلے آ رہے ہیں کہ اس کا ذمہ دار دوسروں کو ٹھہرا دیا جائے۔ مثلاً ماہنامہ محدث کی ذوالحجہ ۱۳۹۶ء کی اشاعت میں اس موضوع پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے۔

ہمارے نزدیک اسلامی آئین اور شریعت (نظامِ مصطفےٰ) کے نفاذ میں التواء مغربی تہذیب کے ذہنی غلاموں۔ خود غرض اور بے خدا سیاستدانوں کی مکروہ سازشوں کا نتیجہ ہے۔

(صفحہ ۱۰)

طلوعِ اسلام مغربی تہذیب کے ذہنی غلاموں، خود غرض اور بے خدا سیاستدانوں کی طرف سے وکیل نہیں۔ لیکن ملک میں جو اسلامی نظام نافذ نہیں ہو سکا تو خدا کو حاضر ناظر جان کر کہیئے کہ کیا اس کی وجہ یہ نہیں کہ آپ حضرات پبلک لاز کا ایک متفق علیہ ضابطہ مرتب ہی نہیں کر سکتے۔

جریدۂ "محدث" نے جو کچھ کہا ہے وہ کوئی نئی بات نہیں۔ صدر ایوب مرحوم نے ۱۹۶۸ء میں مختلف فرقوں کے علماء حضرات کو دعوت دی تھی کہ وہ ایک متفق علیہ ضابطۂ قوانین مرتب کریں۔ اس کے بعد کہا تھا کہ:

اگر میں صدر رہا تو آنکھیں بند کر کے اس قانون پر دستخط کر دوں گا۔

(نوائے وقت۔ ۳۱ دسمبر ۱۹۶۸ء)

آپ کو معلوم ہے کہ مرحوم کی اس دعوت کا جواب کیا دیا گیا؟
یہ کہ:-

یہ شخص بدنیت ہے اور علماء کے اختلاف کو خواہ مخواہ سپر بنا رہا ہے۔

(مودودی صاحب کا بیان۔ بحوالہ نوائے وقت۔ ۲۰ جنوری ۱۹۶۹ء)

ہم ملک کے سوچنے سمجھنے والے طبقہ سے درخواست کریں گے کہ وہ ان تصریحات پر غور فرمائیں اور پھر سوچیں کہ ملک میں آج تک اسلامی نظام کیوں نافذ نہیں ہو سکا؟ اور اس کے بعد یہ بھی سوچیں کہ کیا ان حضرات کے ہاتھوں یہ نظام کسی صورت میں بھی نافذ ہو سکتا ہے؟

یہ نظام کس طرح نافذ ہو سکتا ہے اس کے لئے آپ اس مقالہ کا بغور مطالعہ کیجئے جو چند صفحات بعد آپ کے سامنے آ رہا ہے۔

(۱) وہ کتاب جس کی تیاری میں برسوں لگے اور جو صدیوں تک تر و تازہ رہے گی۔

(۲) اس میں قریب دو ہزار چار سو عنوانات ہیں جن میں سے ہر عنوان کے تحت ان تمام آیات کا حوالہ دیا گیا ہے جن میں بلا واسطہ یا بالواسطہ قرآنِ مجید میں اس موضوع کے متعلق کچھ آیا ہے۔

(۳) یہ کتاب بڑے سائز کے ڈیڑھ ہزار سے زائد صفحات پر مشتمل ہے عمدہ سفید کاغذ۔ اوفسٹ کی طباعت۔ بغرضِ سہولت تین مضبوط اور جاذبِ نگاہ جلدوں میں شائع کی گئی ہے۔ اور پورا سیٹ بکس میں محفوظ ہے۔

(۴) قیمت مکمل سیٹ ایک سو ساٹھ روپے محصول ڈاک چھ روپے

تبویب القرآن

ملنے کا پتہ:-

(۱) مکتبۂ دین و دانش۔ چوک اردو بازار لاہور۔ (۲) ادارۂ طلوعِ اسلام ۲۵ بی۔ گلبرگ ۲ لاہور

باسمہٖ تعالیٰ

ایک مہیب خطرہ

پاکستان میں سیکولر اسلام

پھر نہ کہنا ہمیں خبر نہ ہوئی

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

پاکستان میں سیکولر اسلام

پھر نہ کہنا ہمیں خبر نہ ہوئی

سوال یہ ہے کہ پاکستان میں جو کچھ مذہب کے نام سے ـــــ کیا جا رہا ہے، اس کی حقیقت کیا ہے۔ مقصد کیا اور انجام کیا۔ یہ سوال جس قدر اہم اور گہرا ہے، اس کا جواب اسی قدر غور و فکر کا متقاضی۔

اس سوال کے سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ (سب سے پہلے) مذہب اور دین کا فرق سمجھ لیا جائے گا۔ یہ اس لئے کہ اسلام کو بھی مذہب کہا جاتا ہے حالانکہ یہ مذہب نہیں، دین ہے۔ اس وقت جس قدر الجھنیں پیدا ہو رہی ہیں اس کی وجہ اس فرق کو ملحوظ نہ رکھنا ہے۔

مذہب، خدا اور انسان کے درمیان ایک پرائیویٹ تعلق کا نام ہے۔ ظاہر ہے کہ جب اسے پرائیویٹ تعلق کہا جائے گا تو اسے ماپنے، تولنے، پرکھنے کا کوئی خارجی معیار نہیں ہوگا۔ اس کے متعلق کہا یہ جائے گا کہ اس سے انسان کو اطمینانِ قلب حاصل ہو جاتا ہے۔ اور اطمینانِ قلب وہ ذاتی اور داخلی کیفیت ہے جسے نہ کوئی دوسرا شخص دیکھ سکتا ہے، نہ محسوس کر سکتا۔ اسی لئے اس کیفیت کے متعلق کہا جاتا ہے کہ: ؎

ذوقِ ایں بادہ ندانی بخدا تا نچشی

دنیائے مذاہب میں کہا جاتا ہے کہ یہ اطمینان (ہندوؤں کی اصطلاح میں) ایشور پرماتما کی پوجا پاٹ یا بھگتی سے حاصل ہوتا ہے۔ عیسائیوں کے ہاں اسے (WORSHIP) کہا جاتا ہے۔ مجوسی (ایرانی زرتشتی) اسے پرستش کہہ کر پکارتے ہیں۔ اس کے لئے، پوجا پاٹ یا پرستش کے چند فرائض کی ادائیگی یا چند مخصوص شعائر کی بجا آوری کافی ہوتی ہے۔ دنیاوی معاملات سے اسے کچھ واسطہ نہیں ہوتا۔ وہ دنیاداری کے طریقوں کے مطابق طے پاتے ہیں۔

جس اسلام کو خدا نے نازل کیا اور جسے اس کے آخری رسول (نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم) نے دنیا کو دیا تھا وہ دین تھا۔ مذہب نہیں تھا۔ (مذہب کا تو لفظ تک قرآنِ مجید میں نہیں آیا)۔ اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ (۳/۱۹) خدا کے نزدیک (یعنی اس کا متعین اور عطا فرمودہ) الدین، اسلام ہے۔ دوسری جگہ ہے۔ وَمَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْہُ۔ (۳/۸۵) جو شخص اسلام کے سوا کوئی اور دین اختیار کرے گا تو خدا کے ہاں اسے قبول نہیں کیا جائے گا۔ دین کے معنی ہوتے ہیں نظامِ حیات، ضابطۂ زندگی۔ اور جب اسے الدین (یعنی خدا کی طرف سے عطا کردہ دین) کہا جائے تو

اسلام، دین ہے

اس کے معنی ہوں گے وہ نظامِ حیات جسے قوانین و اقدارِ خداوندی کے مطابق قائم اور متشکل کیا جائے۔ عام فہم الفاظ میں کہا جائے گا کہ اسلام وہ طریق ہے جس کے مطابق انسان کو اپنی (انفرادی اور اجتماعی) زندگی بسر کرنی چاہیئے۔ ظاہر ہے کہ انسان کسی خاص ضابطہ یا قوانین کے مطابق زندگی اپنی آزاد مملکت ہی میں بسر کر سکتا ہے۔ اگر کسی مملکت میں ضوابط اور قوانین غیر خداوندی رائج ہوں تو وہاں اسلام کے مطابق زندگی بسر کی ہی نہیں جا سکتی۔ یہ وجہ ہے کہ قرآن کریم نے دین کے مطابق زندگی بسر کرنے کے لئے، ایک آزاد مملکت کا ہونا شرطِ اوّلیں قرار دیا ہے۔ اگرچہ اس سلسلہ میں متفرق احکام و ہدایات قرآن کریم کے مختلف مقامات پر بکھری ہوئی ہیں لیکن اس نے اسے آیۂ استخلاف میں نہایت جامع شکل میں بیان کر دیا ہے۔ ارشاد ہے۔ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ۔ (۲۴/۵۵) اے نوعِ انسان! تم میں سے جو لوگ خدا کے نازل کردہ ضابطہ، قوانین کی صداقت پر ایمان لائیں،

استخلاف فی الارض

اور اس کے بتائے ہوئے طریق کے مطابق صلاحیت بخش امور سرانجام دیں، خدا نے ان سے وعدہ کر رکھا ہے کہ وہ انہیں اسی دنیا میں برسرِ اقتدار بنا دیگا۔ انہیں انکی اپنی آزاد مملکت عطا کر دے گا۔ آیت کے اتنے حصے میں دو باتیں خاص طور پر غور طلب ہیں۔

(۱) اللہ کے وعدہ سے مراد ہوتی ہے اس کا متعین فرمودہ قانون یا اصول۔ یہ قوانین یا اصول غیر متبدل ہوتے ہیں ـــــ اسی لئے کہا گیا ہے کہ خدا کبھی وعدہ خلافی نہیں کرتا۔ لہٰذا، خدا کا یہ غیر متبدل قانون ہے کہ ایمان اور اعمالِ صالحہ کا لازمی نتیجہ استخلاف فی الارض ہے۔ یعنی دنیا میں اپنی آزاد مملکت کا قیام۔ اس سے، ایمان اور اعمال صالحہ کے پرکھنے کی ایک واضح اور محسوس کسوٹی ہمارے سامنے آگئی۔ یعنی جس ایمان اور جن اعمال کا نتیجہ استخلاف فی الارض نہیں، نہ وہ ایمان، معیارِ خداوندی کے مطابق ایمان ہے، نہ وہ اعمال، اعمالِ صالحہ۔ اس کسوٹی کی شہادت کے طور پر کہا کہ یہ کوئی نئی بات نہیں۔ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ۔ (۲۴/۵۵) ان سے پہلے گذری ہوئی اقوام کے سلسلہ میں بھی یہی اصولِ خداوندی کارفرما رہا ہے۔ اقوامِ سابقہ کے تاریخی شواہد اس حقیقت کی صداقت کا ثبوت ہیں ـــــ ظاہر ہے کہ اس سے بڑا اور بہتر خارجی معیار کوئی اور ہو نہیں سکتا۔

(۲) دوسری بات یہ سامنے آئی کہ استخلاف فی الارض۔ یعنی اسلام میں اقتدار یا مملکت، ایمان و اعمالِ صالحہ کا نتیجہ ہوتی ہے۔ بالفاظِ دیگر، جو مملکت محض قوت کے بل بوتے پر حاصل کی جائے، یا وراثتاً مل جائے۔ وہ قرآنی استخلاف فی الارض نہیں ہوگی۔ اس طرح حاصل کردہ مملکت کو ملوکیت کہا جائے گا۔ ہمارے ہاں، خلافت اور ملوکیت کی جو باہمد گر متضاد اصطلاحات استعمال ہوتی ہیں، بنیادی طور پر ان میں یہی فرق ہے۔ جو مملکت، ایمان و

ملوکیت

اعمالِ صالحہ کے نتیجہ میں حاصل ہو اسے "خلافت" سے تعبیر کیا جائے گا۔ جو کسی اور طریق سے حاصل کی جائے اسے "ملوکیت" کہہ کر پکارا جائے گا۔ ان دونوں میں یہ پہلا فرق، طریقِ حصولِ مملکت کا ہے۔ ان میں دیگر متمیزات آگے چل کر سامنے آئیں گے۔

آیۂ استخلاف کے اگلے ٹکڑے میں بتایا گیا ہے کہ یہ مملکت، مقصود بالذات نہیں، بلکہ ایک بلند و بالا مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے۔ وہ مقصد کیا ہے۔ فرمایا۔ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ۔ (۲۴/۵۵) مقصد اس سے یہ ہے کہ وہ دین (وہ نظامِ حیات) متمکن (ESTABLISH) ہو جائے جسے خدا نے تجویز کیا ہے۔ یعنی

"خلافت" سے مقصد دِین کا تمکن ہے۔ اس سے دو باتیں واضح ہو گئیں۔

(۱) اپنی آزاد مملکت کے بغیر دین متمکن نہیں ہو سکتا۔

(۲) جس مملکت کا مقصد، دین کا تمکن نہ ہو، وہ خلافت نہیں، ملوکیت ہو گی۔ اور ملوکیت دنیا میں ہر فساد کی جڑ ہے۔ علامہ اقبالؒ نے ضربِ کلیم میں، قوت اور دین، کے عنوان سے جو نظم لکھی ہے، وہ درحقیقت خلافت اور ملوکیت کے اسی فرق کو نمایاں کرتی ہے۔ کہتے ہیں: ؎

اسکندر و چنگیز کے ہاتھوں سے جہاں میں　　　سو بار ہوئی حضرتِ انساں کی قبا چاک

تاریخِ امم کا یہ پیامِ ازلی ہے　　　صاحب نظراں نشۂ قوت ہے خطرناک!

اس سیلِ سبک سیر و زمیں گیر کے آگے　　　عقل و نظر و علم و ہنر ہیں خس و خاشاک

لا دیں ہو تو ہے زہرِ ہلاہل سے بھی بڑھ کر

ہو دیں کی حفاظت میں تو ہر زہر کا تریاک

اُنہوں نے، ارمغانِ حجاز میں، خلافت و ملوکیت میں فرق، ان الفاظ میں واضح کیا ہے: ؎

خلافت بر مقامِ ما گواہی است　　　حرام است آنچہ بر ما پادشاہی است

ملوکیت ہمہ مکر است و نیرنگ　　　خلافت حفظِ ناموسِ الٰہی است!

اس سے آگے یہ سوال سامنے آتا ہے کہ دین کے تمکن کا نتیجہ کیا ہو گا؟ اس سے حاصل کیا ہو گا۔ جو مملکت، دین کی حفاظت کے لئے قائم ہو گی اس میں افرادِ انسانیہ کی کیفیت کیا ہو گی۔ قرآنِ مجید نے ایسے وسیع سوال کا جواب، دو لفظوں میں دے دیا جب فرمایا کہ: وَلَيُبَدِّلَنَّهُم مِّن بَعْدِ خَوْفِهِمْ أَمْنًا۔ (۲۴/۵۵)۔ اس سے، ان کا خوف امن سے بدل جائے گا۔ آپ نے غور فرمایا کہ قرآن مجید نے ان دو لفظوں میں، اتنی بسیط حقیقت کو کس طرح سمٹا کر رکھ دیا ہے؟ دنیا میں انسان چاہتا کیا ہے؟ امن ـــــ یعنی ہر قسم کے خوف اور ڈر سے مامونیت (SECURITY) کی پوری پوری ضمانت۔ انسان، جب خوف سے مامون ہو جائے تو پھر اس کی انسانی صلاحیتوں کی نشوونما شروع ہو جاتی ہے۔ سارا قرآن، اس ایک نکتہ کی تفصیل سے بھرا پڑا ہے کہ قرآنی معاشرہ میں کس طرح ہر فرد، خوف سے مامون ہوتا ہے، اور اس کی انسانی صلاحیتیں نشوونما پاتی ہیں۔

سوال یہ ہے کہ خوف کی وجہ کیا ہوتی ہے؟ اس کا ایک لفظ میں جواب ہے ـــــ احتیاج!

آنچہ شیراں را کند روباہ مزاج　　　احتیاج و احتیاج و احتیاج

ملوکیت میں، صاحبِ اقتدار طبقہ، رزق کے سرچشموں کو اپنے قبضہ میں لے کر، افرادِ معاشرہ کو اُن کا محتاج بنا دیتا ہے جس سے وہ ان کا ہر حکم ماننے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ خلافت میں کوئی فرد، کسی کا محتاج نہیں ہوتا ـــــ اور جب محتاج نہیں ہوتا، تو کسی کا محکوم بھی نہیں ہوتا۔ علامہ اقبالؒ نے نظامِ خلافت کی خصوصیت دو مصرعوں میں نہایت جامعیت سے بیان کر دی ہے جہاں کہا ہے کہ: ؎

کس دریں جا سائل و محروم نیست　　　عبد و مولا۔ حاکم و محکوم نیست

سائل ایسے شخص کو کہتے ہیں جس کی اپنی محنت کا ماحصل اس کی ضروریات پوری کرنے کے لئے کافی نہ ہو، اس لئے وہ بقایا

ضروریات کے لئے دوسرے کا محتاج ہو۔ اور محروم ایسے شخص کو کہتے ہیں جو اپنی روٹی آپ کمانے سے معذور ہو۔ خلافت (یا قرآنی مملکت) ہر فرد کی ضروریاتِ زندگی بہم پہنچانے کی ذمہ داری خود لیتی ہے اس لئے اس میں نہ کوئی فرد سائل ہوتا ہے، نہ محروم۔ جب کوئی شخص اپنی ضروریات کے لئے کسی کا دست نگر نہ ہو، تو وہ کسی دوسرے کا حکم ماننے پر بھی مجبور نہیں ہوگا۔ لہٰذا، اس معاشرہ میں نہ کوئی کسی کا غلام ہوگا۔ نہ کوئی کسی کا آقا۔ نہ کوئی حاکم ہوگا، نہ محکوم۔ (حاکم و محکوم کے نکتہ کی مزید وضاحت ذرا آگے چل کر سامنے آئے گی)۔

اور جب، نہ کوئی کسی کا محتاج ہوگا نہ محکوم تو انسان کے دل سے دوسرے انسانوں کا خوف خود بخود جاتا رہے گا۔ اگلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس نظام میں حاکم و محکوم کی تمیز کس طرح ختم ہوگی۔ جب مملکت ہوگی تو اس میں حکومت بھی ہوگی۔ اور جب حکومت ہوگی تو اس میں حاکم بھی ہوں گے اور محکوم بھی۔ پھر یہ تفریق کس طرح سے مٹ سکے گی۔ حاکم اور محکوم کی تفریق کے بغیر حکومت کیسے قائم ہوگی؛ خلافت کی یہ وہ منفرد خصوصیت ہے جو دنیا کے کسی اور نظام میں ممکن ہی نہیں۔

سوال یہ ہے کہ حاکم کسے کہتے ہیں؛ اس کا جواب یہ ہے ـــــ جس کے حکم کی تعمیل یا اطاعت کی جائے ـــــ شخصی حکومت میں، اطاعت صاحبِ اقتدار کے حکم کی جاتی ہے۔ دورِ حاضرہ میں اطاعت ان قوانین کی کی جاتی ہے، جنہیں، صاحبِ اقتدار طبقہ وضع کرتا ہے۔ خلافت میں حکم دینے یا قوانین وضع کرنے کا اختیار کسی انسان (یا انسانوں کی جماعت) کو حاصل ہی نہیں ہوتا۔ یہ اختیار صرف خدا کو ہوتا ہے۔ اس حقیقت کے اظہار کے لئے آیۂ استخلاف کے اگلے ٹکڑے میں فرمایا۔ یَعْبُدُوْنَنِیْ لَا یُشْرِکُوْنَ بِیْ شَیْئًا۔ (۲۴/۵۵) دین کے اس تمکن (مملکت) کا مقصد یہ ہے کہ لوگ صرف خدا کی محکومیت اختیار کریں۔ اور اس میں کسی انسان کے حکم کو شریک نہ کیا کریں۔ قرآن کریم کی رو سے عبادت سے مفہوم ہی خدا کی محکومیت یا اطاعت اختیار کرنا ہے۔ مثلاً اس نے سورۂ کہف میں کہا کہ: لَا یُشْرِکْ بِعِبَادَۃِ رَبِّہٖٓ اَحَدًا۔ (۱۸/۱۱۰)۔ انسان کو چاہیئے کہ خدا کی "عبادت" میں کسی کو شریک نہ کرے۔ اور دوسری جگہ یہ کہہ کر اس کی وضاحت کر دی کہ: لَا یُشْرِکُ فِیْ حُکْمِہٖٓ اَحَدًا (۱۸/۲۶) خدا اپنی حکومت میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔ اس سے قرآن مجید نے خود واضح کر دیا کہ "خدا کی عبادت کرنے" سے مفہوم اس کی محکومیت یا اطاعت اختیار کرنا ہے۔ سورۂ یوسف میں پہلے کہا کہ: اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ۔ (۱۲/۴۰)۔ یاد رکھو! حقِ حکومت صرف خدا کو حاصل ہے۔ اور اس کے بعد کہا۔ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِیَّاہُ۔ اس نے حکم دیا ہے کہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کی جائے۔ ظاہر ہے کہ یہاں عبادت کے معنی "اللہ کے حکم کی اطاعت۔ یا خدا کی محکومیت اختیار کرنا ہیں"۔ اس کے بعد کہا کہ، ذٰلِکَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ۔ (۱۲/۴۰) یہ ہے دینِ قیم۔ محکم، نظامِ مملکت۔

محکومیت صرف خدا کی

اس سے واضح ہے کہ ملوکیت میں، انسانوں کے احکام (یا قوانین) کی اطاعت کی جاتی ہے۔ اور خلافت میں اطاعت صرف قوانینِ خداوندی کی ہوتی ہے۔ اسی کو خدا کی عبادت (محکومیت) کہا جاتا ہے۔ اگر کسی مملکت میں انسانوں کے احکام یا قوانین کی اطاعت کی جائے تو وہاں دین کا تمکن نہیں ہوتا۔ دین کے تمکن کے معنی ہیں حکومتِ خداوندی کا قیام۔

اس کے بعد یہ اہم سوال سامنے آتا ہے کہ محکومیت تو کسی محسوس اتھارٹی کی کی جاتی ہے۔ لیکن خدا کی ہستی محسوس نہیں۔ اسے نہ ہم دیکھ سکتے ہیں، نہ اس کی آواز سن سکتے ـــــ پھر اس کی محکومیت کیسے اختیار کی جائے گی۔ اس کی اطاعت کس

کتاب اللہ کی حکومت

طرح کی جائے گی، اس کا نہایت واضح جواب، اللہ تعالیٰ نے خود ہی دے دیا۔ فرمایا۔ اَفَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْتَغِيْ حَكَمًا وَّهُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ اِلَيْكُمُ الْكِتٰبَ مُفَصَّلًا۔ (۶/۱۱۵) ـــــ (اے رسول! ان سے کہو کہ) کیا تم چاہتے ہو کہ میں خدا کے سوا کسی اور کی محکومیت اختیار کروں، جبکہ اس نے تمہاری طرف اپنا وہ ضابطہ، قوانین نازل کر دیا ہے جو ہر بات کو نکھار اور اُبھار کر نہایت وضاحت سے بیان کر دیتا ہے۔

اس سے واضح ہے کہ خدا کی محکومیت، اس کی کتاب کی اطاعت، کی رو سے کی جاتی ہے۔ یہ عجیب حقیقت ہے کہ دورِ قدیم میں تو اطاعت اس اتھارٹی کی کی جاتی تھی جو (بادشاہ کی شکل میں) محسوس طور پر سامنے ہوتی تھی۔ لیکن اس زمانے میں، حکم دینے والی اتھارٹی محسوس شکل میں سامنے نہیں ہوتی۔ اطاعت اس کے قوانین کی کی جاتی ہے۔ قانون کی حکومت (RULE OF THE LAW) کا نظریہ قرآنِ کریم نے آج سے چودہ سو سال پہلے دے دیا تھا۔

لہٰذا، خلافت اور ملوکیت میں اگلا فرق یہ ہوا کہ خلافت میں اطاعت، قوانین خداوندی کی کی جاتی ہے ـــــ اور ملوکیت میں ان قوانین کی جو انسانوں کے وضع کردہ ہوتے ہیں۔ خلافت میں صاحبِ اقتدار طبقہ کا فریضہ احکام و قوانین خداوندی کا نافذ کرنا ہوتا ہے۔ قوانین وضع کرنا نہیں۔ اسی لئے، اور تواتر، خود حضورؐ نبی اکرم سے فرمایا گیا کہ:

فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ۔ (۵/۴۸)

تم ان کے نزاعی امور کے فیصلے خدا کی کتاب کی رو سے کرو۔ تم ان میں، مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ کے مطابق حکومت قائم کرو۔[1]

اور اسی کو کفر و ایمان میں حدِ فاصل اور خطِ امتیاز قرار دیا گیا جہاں کہا کہ:

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ۔ (۵/۴۴)

جو لوگ خدا کی کتاب کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے انہی کو کافر کہا جاتا ہے۔

اسی بنا پر آیۂ استخلاف کے آخر میں فرمایا کہ: وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ۔ (۲۴/۵۵) جو لوگ اس قدر واضح ہدایت کے بعد کفر اختیار کر لیں۔ (یعنی، قوانینِ خداوندی کے بجائے) انسانی قوانین کی محکومیت اختیار کریں، تو وہ اس قالب (PATTERN) سے نکل جائیں گے جس میں رہتے ہوئے انسانی صلاحیتوں کی نشوونما ہے۔ (فسق کے بنیادی معنی یہی ہیں)۔

یہ ہے خلافت اور ملوکیت میں فرق۔ حکومتِ خداوندی اور انسانی حکومت میں خطِ امتیاز۔ ہمارے دور میں انسانوں کی حکومت کو سیکولر اسٹیٹ کہا جاتا ہے خواہ اس کی شکل کوئی بھی ہو۔

---

[1] حال ہی میں (ریٹائرڈ) جسٹس بی۔ زیڈ۔ کیکاؤس نے لکھا ہے کہ "اسلام میں قانون سازی کا اختیار سرے سے ہوتا ہی نہیں۔ رسولِ اکرمؐ کو ذرہ برابر قانون سازی کا اختیار نہیں تھا۔ (اسلامی جمہوریہ ۲۱ تا ۲۷ نومبر ۱۹۷۷ء صفحہ ۳۷) واضح رہے کہ جسٹس صاحب متحدہ محاذ والوں کے سرگرم مؤید ہیں۔

سب سے پہلی اسلامی مملکت

دین اللہ کا تمکن (یا خلافت کا قیام) انسانوں کے ہاتھوں ہی سے ہوتا ہے۔ اسے سب سے پہلے حضور نبی اکرمؐ نے، جماعت مومنین کی رفاقت سے قائم فرمایا۔ ظاہر ہے کہ یہ مملکت نہ بزورِ شمشیر حاصل کی گئی تھی نہ وراثت میں ملی تھی۔ یہ (آیۂ استخلاف کے مطابق) ایمان و اعمال صالحہ کا فطری نتیجہ تھی۔ اس کی خصوصیات یہ تھیں :-

۱۔ اس میں مملکت کے آئین و قوانین کی بنیاد، خدا کی کتاب، قرآن کریم تھی۔ بالفاظِ دیگر، اس مملکت میں حکمرانی کتاب اللہ کی تھی۔

۲۔ قرآن مجید میں، چند ایک احکام کے سوا، اقدار و اصول دیئے گئے ہیں۔ انہیں حدود اللہ بھی کہا جاتا ہے۔ مملکت کا فریضہ یہ تھا کہ ان حدود کے اندر رہتے ہوئے، اقدار و اصولِ قرآنیہ کی روشنی میں اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق جزئی قوانین مرتب کرے۔ بالفاظ دیگر وہ ضوابط و طریق کار متعین کرے جن کے مطابق قرآنی احکام و اصول پر عمل پیرا ہوا جا سکے۔ یہ جزئی قوانین مشاورت کے ذریعے مرتب ہوتے تھے۔ ان میں پرسنل لا اور پبلک لا کی کوئی تفریق نہیں تھی۔ اور ان کا اطلاق پوری کی پوری اُمت پر یکساں ہوتا تھا۔ کتاب اللہ کے اصول و اقدار تو غیر متبدل رہتے تھے، لیکن ان کی روشنی میں مرتب کردہ جزئی قوانین میں، عند الضرورت تبدیلی ہو سکتی تھی۔ یہ تمام احکام و قوانین مملکت کی مرکزی اتھارٹی کی طرف سے نافذ ہوتے تھے۔ مذہبی پیشوائیت کا اس میں وجود تک نہ تھا۔ قرآن اس نظامِ کہن کو ختم کر دینے کے لئے آیا تھا۔

۳۔ اس میں ساری اُمت، امتِ واحدہ تھی۔ یعنی اس میں نہ مذہبی فرقے تھے نہ سیاسی پارٹیاں۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے دین میں تفرقہ کو شرک (۳۰/۳۲) اور خدا کے عذاب کا مستوجب قرار دیا ہے۔ (۳/۱۰۵) اس کی مجلسِ مشاورت (پارلیمان) میں حزبِ اقتدار اور حزبِ اختلاف کا تصور تک نہ تھا۔ اس میں (معاذ اللہ) یہ صورت نہیں تھی کہ حضرت ابوبکر صدیق رضؓ اور حضرت عمر رضؓ مع اپنی پارٹی کے ایک طرف حزبِ اقتدار کی مسند پر تشریف فرما ہوں اور حضرت عثمان رضؓ اور حضرت علی رضؓ اپنی پارٹی کے ساتھ ان کے مدِ مقابل حزبِ اختلاف کی بنچوں پر! ـــــ قرآنِ کریم کی رو سے، یہ اقتدار ساری کی ساری اُمت کو حاصل تھا، نہ کہ کسی ایک طبقہ کو۔

یہ تھی دینِ خداوندی کی وہ عملی شکل جسے نبی اکرمؐ نے قائم فرمایا۔ اسے آپ خلافت کہہ لیجئے۔ اسلامی مملکت کہہ لیجئے۔ اقامتِ دین کہہ لیجئے۔ حکومتِ خداوندی سے تعبیر کر لیجئے۔ بات ایک ہی ہے۔ یعنی کتاب اللہ کی حکمرانی۔

اس سلسلہ میں (ضمناً) ایک اہم نکتہ کی وضاحت ضروری ہے۔ ہمارے ہاں آجکل "نظامِ مصطفیٰ" کی اصطلاح رائج ہو رہی ہے۔ اگر اس سے مراد ہے دینِ خداوندی کا وہ عملی نظام جسے نبی اکرمؐ نے قائم فرمایا تھا، تو پھر اس میں اعتراض کی بات نہیں۔ لیکن اگر اس میں، نظام کا لفظ خود دین کے معنوں میں استعمال کیا گیا ہے، تو قرآن کریم کی رو سے، یہ درست نہیں۔ قرآنِ مجید میں اسلام کو دین اللہ کہا گیا ہے۔ بالفاظِ دیگر، دین، خدا کی طرف سے ملتا تھا جسے حضرات انبیاء کرامؑ دنیا میں رائج کرتے تھے۔ دین، خود کسی رسول کا وضع کردہ نہیں ہوتا تھا۔ مستشرقین نے اسلام کے لئے (MOHAMMADANISM) اور مسلمانوں کے لئے (MOHAMMADANS) کی اصطلاحات

وضع کیں۔ چونکہ ان سے اسلام کے متعلق بہت بڑی غلط فہمی پیدا ہوتی تھی اس لئے انہیں کافی تگ و تاز کے بعد بدلوایا گیا۔ چونکہ "نظامِ مصطفٰےؐ" کی اصطلاح سے، اسی قسم کی غلط فہمی پیدا ہو جانے کا امکان ہے۔ اس لئے ہم سمجھتے ہیں کہ اس کے بجائے دینِ خداوندی یا قرآنی نظام کہنا بہتر ہوگا۔ بہرحال یہ تھا وہ نظامِ مملکتِ قرآنیہ جسے حضور نبی اکرمؐ نے قائم فرمایا۔ یہ نظام اس وقت تک قائم رہا جب تک قرآن کی حکمرانی رہی۔ اس کے بعد خلافت، ملوکیت میں بدل گئی۔ یعنی مملکت میں قرآن کی حکمرانی نہ رہی۔ ملوکیت میں۔

ملوکیت میں کیا ہوا

(۱) سب سے پہلی تبدیلی یہ ہوئی کہ اُمت میں ثنویت (DUALISM) پیدا ہو گئی۔ یعنی دنیاوی امور الگ ہو گئے اور "مذہبی امور" الگ۔ بالفاظِ دیگر، پبلک لاز اور پرسنل لاز الگ الگ ہو گئے۔ پبلک لاز مملکت کی تحویل میں رہے اور پرسنل لاز مذہبی پیشوائیت کے حیطۂ اقتدار میں آ گئے۔ اس طرح اُمت میں دو متوازی نظامہائے اقتدار وجود میں آ گئے۔

(۲) پبلک لاز حکمرانوں کی مصلحت، منشاء اور مرضی کے مطابق مرتب ہونے لگے اور پرسنل لاز مذہبی پیشوائیت کی منشاء کے مطابق۔ ان میں عقائد۔ عبادات۔ مذہبی شعائر اور مناسک بھی شامل تھے۔ اس سے مختلف مذہبی فرقے وجود میں آ گئے اور ہر فرقہ کا الگ الگ ضابطۂ شریعت بن گیا۔ اسے فقہ کہا جاتا ہے۔ اسی طرح اُمت کی عملی زندگی میں قرآن باقی نہ رہا۔ حصولِ ثواب کے لئے اس کی صرف تلاوت باقی رہ گئی۔ عصرِ حاضر میں اس قسم کی مملکت کو سیکولر اسٹیٹ کہا جاتا ہے۔ بالفاظِ دیگر قرآن کی حکمرانی کے بعد، مسلمانوں میں سیکولر نظام رائج ہو گیا۔ اور یہ نظام مسلمانوں کی تمام مملکتوں میں اب تک رائج چلا آ رہا ہے۔ واضح رہے کہ اگر کسی مملکت میں بعض جرائم کی سزائیں احکامِ قرآنی کے مطابق دی جائیں تو اس سے وہ مملکت اسلامی نہیں بن جاتی۔ بھارت میں جرمِ قتل کی سزا موت ہے جو قرآن کے مطابق ہے۔ لیکن اس سے بھارت کی حکومت، اسلامی تو نہیں بن جاتی۔ اسلامی مملکت یا حکومت صرف وہ کہلا سکتی ہے جس میں زندگی کے تمام گوشوں پر قرآنِ مجید کی حکمرانی ہو۔

(۳) اس ثنویت کی رو سے، اسلام صرف اعتقادات، عبادات اور پرسنل لاز کا نام رہ گیا۔ یعنی اس شعبہ کا نام جو مذہبی پیشوائیت کی تحویل میں تھا۔ چونکہ یہ شعبہ حکومت سے الگ تھا اس لئے تصور یہ پیدا ہو گیا کہ اسلام پر کاربند ہونے کے لئے مسلمانوں کی اپنی آزاد حکومت یا مملکت کا ہونا لازمی نہیں۔ اسلام پر ہر اس حکومت میں کاربند رہا جا سکتا ہے جو مسلمانوں کو (نماز، روزہ، وغیرہ کی) مذہبی آزادی دے دے۔ (مثلاً) ہندوستان میں، انگریزوں نے مسلمانوں کو "مذہبی آزادی" دے دی تھی اس لئے وہاں ہماری مذہبی پیشوائیت مطمئن تھی کہ اسلام پر کاربند ہونے میں کوئی امر مانع نہیں۔ اس تصور کے راستے میں آیۂ استخلاف سب سے بڑی رکاوٹ تھی۔ اس کی تاویل یوں کر لی گئی کہ اس سے مراد "روحانی خلافت" ہے۔ دنیاوی سلطنت سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ اسی قسم کی معنوی تحریف، قرآن کی دیگر اصطلاحات میں بھی کر لی گئی۔ قرآن میں امر بالمعروف، اور نہی عن المنکر سے مراد تھی مملکت کی طرف سے نافذ کردہ قوانین۔ لیکن اب اس کا مطلب وعظ و نصیحت رہ گیا۔ یہی صورت دین — قرآنی مملکت — کے دیگر ارکان، صلوٰۃ۔ زکوٰۃ۔ وغیرہ سے کے ساتھ ہوئی۔ قرآنِ کریم نے واضح طور پر کہا تھا کہ:

اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَھَوْا

عَنِ الْمُنْكَرِ۔ وَلِلّٰہِ عَاقِبَۃُ الْاُمُوْرِ۔ (۲۲/۴۱)

یہ وہ لوگ ہیں (یعنی مومنین) کہ جب انہیں ملک میں اقتدار حاصل ہوگا تو یہ اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کا نظام قائم کریں گے۔ اور معروف کا حکم دیں گے اور منکر سے روکیں گے۔ اور ان کی مملکت میں تمام امور، قانونِ خداوندی کی رو سے سرانجام پائیں گے۔

اس آیت سے واضح ہے کہ اقامتِ صلوٰۃ۔ ایتائے زکوٰۃ۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے لئے تمکن فی الارض —— اپنی آزاد مملکت —— کی شرط لازمی تھی۔ یعنی یہ امور ایسے تھے جو صرف اپنی آزاد مملکت میں سرانجام دیئے جا سکتے تھے۔ لیکن جب ان اصطلاحات کا مفہوم محض نماز پڑھنا۔ زکوٰۃ (خیرات) دینا اور وعظ کہنا لے لیا گیا تو ان کے لئے اپنی آزاد مملکت کی موجودگی ضروری نہ رہی۔ ان پر، غیر مسلموں کی حکومت میں بھی عمل کیا جا سکتا تھا۔ چنانچہ ہندوستان میں انگریزوں نے مسلمانوں کو "مذہبی آزادی" دے رکھی تھی اور وہاں کی ہندو حکومت میں آج بھی مسلمانوں کو یہ آزادی حاصل ہے اور ہماری مذہبی پیشوائیت اُس وقت بھی مطمئن تھی اور آج بھی مطمئن ہے کہ وہاں اسلام پر عمل پیرا ہونے میں کوئی امر اُس وقت مانع تھا نہ آج مانع ہے۔ جب اقامتِ صلوٰۃ سے مراد صرف نماز پڑھنا اور ایتائے زکوٰۃ کا مفہوم غریبوں کو چند پیسے بطور خیرات دے دینا' رہ جائے تو ان کے لئے واقعی اپنی آزاد مملکت کی ضرورت نہیں رہتی۔

اس طرح اسلام، جو ایک دین تھا' مذہب میں تبدیل ہو گیا۔ اسلامی مملکت (یا خلافت) کی جگہ مسلمانوں کی مملکتوں نے لے لی جن میں سیکولر نظام رائج ہو گیا۔ اور ہمارے مناظرانِ "جہاد" میں مصروف ہو گئے کہ اسلام کو جملہ "مذاہبِ عالم" میں سب سے افضل "مذہب" ثابت کر دیا جائے۔ اور جب غیر مذاہب کے ساتھ مناظروں کی گنجائش نہ رہے تو خود اپنے فرقوں میں مناظرہ بازی اور کفر سازی کی مہم شروع کر دی جائے۔

یہ صورتِ حالات صدیوں سے چلی آ رہی تھی اور اُمت کو مطمئن کرا دیا گیا تھا کہ اسلام کا کچھ نہیں بگڑا۔ ہمارے علماء کرام کو غصہ آتا تھا تو اس بات پر کہ مسلمانوں نے نماز پڑھنا چھوڑ دیا ہے۔ یہ زکوٰۃ نہیں دیتے۔ یہ فسق و فجور میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ کوئی یہ نہیں کہتا تھا کہ ہمارا سارا نظامِ زندگی ہی غیر اسلامی ہو چکا ہے۔

علامہ اقبالؒ کی پکار

یہ آواز ہمارے زمانے میں سب سے پہلے علامہ اقبال (علیہ الرحمۃ) نے اٹھائی اور پورے جذب و کیف، سوز و گداز اور ولولہ و جوش کے ساتھ اٹھائی۔ انہوں نے اُمت کی حالت کا جائزہ لیتے ہوئے، بہ حیثیت مجموعی کہا کہ: ؎

منزل و مقصودِ قرآں دیگر است — رسم و آئینِ مسلماں دیگر است
در دلِ او آتشِ سوزندہ نیست — مصطفےٰ در سینۂ او زندہ نیست
بندۂ مومن ز قرآں برنخورد — در ایاغِ او نہ مے دیدم نہ دُرد
خود طلسمِ قیصر و کسریٰ شکست — خود سرِ تختِ ملوکیت نشست
تا نہالِ سلطنت قوت گرفت — دینِ او نقشِ از ملوکیت گرفت
از ملوکیت نگہ گردد دگر! — عقل و ہوش و رسم و رہ گردد دگر

(جاوید نامہ)

وہ عمر بھر ان اشارات و استعارات کی تشریح و تفسیر مختلف انداز و اسالیب سے کرتے رہے اور جب انہوں نے محسوس کیا کہ اب کھل کر بات کرنے کا وقت آ گیا ہے۔ تو انہوں نے اپنے خطبۂ الٰہ آباد (سنہ ۱۹۳۰ء) میں، اپنا مقصود وضاحت سے بیان کر دیا۔ انہوں نے سب سے پہلے دین اور مذہب کے فرق کو ان الفاظ میں نمایاں کیا:۔

> حقیقت یہ ہے کہ اسلام، خدا اور بندے کے درمیان ایک روحانی واسطہ کا نام نہیں۔ یہ ایک نظامِ حکومت ہے جس کی ہیئتِ ترکیبی میں یہ صلاحیت رکھی گئی ہے کہ وہ ہر عملِ تعمیر کو اپنے اندر جذب کر لے۔ اس نظام کا تعین اس وقت ہو چکا تھا جب کسی روسو کے دماغ میں ایسے نظام کا خیال تک بھی نہیں آیا تھا۔ اس نظام کی بنیاد ایک ایسے اخلاقی نصب العین پر رکھی گئی ہے جس کی رو سے انسان جمادات اور نباتات کی طرح پابگل مخلوق نہیں سمجھا جاتا کہ اس کو کبھی اِس خطۂ زمین سے منسوب کر دیا اور کبھی اُس سے۔ بلکہ وہ ایک ایسی روحانی ہستی سمجھا جاتا ہے جس کی صحیح قدر و قیمت اس وقت معلوم ہوتی ہے جب وہ ایک خاص معاشرتی نظام کی مشینری میں اپنی جگہ فِٹ ہو۔ وہ ایک فعّال مشینری کا پرزہ ہوتا ہے اور اسے ٹھیک انداز میں چلانے کے لئے اس پر حقوق و فرائض کی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔

اس نظری بحث کے بعد وہ اُس عملی سوال کی طرف آئے جس کے لئے یہ تمہید اٹھائی گئی تھی۔ اس ضمن میں انہوں نے کہا:۔

> ہندوستان دنیا بھر میں بہت بڑا اسلامی ملک ہے۔ اس ملک میں اسلام بہ حیثیت ایک تمدنی قوت کے اسی صورت میں زندہ رہ سکتا ہے کہ اسے ایک مخصوص علاقہ میں مرکوز کر دیا جائے۔ مسلمانانِ ہند کے اس زندہ اور جاندار طبقہ ہیں، کہ جس کے بل بوتے پر یہاں برطانیہ کی حکومت قائم ہے، (باوجودیکہ برطانیہ نے ان سے کبھی منصفانہ برتاؤ نہیں کیا)۔ اگر یوں ایک مرکزیت قائم کر دی جائے تو یہ آخرالامر نہ صرف ہندوستان بلکہ تمام ایشیا کی گتھیاں سلجھا دے گا۔

اس کے بعد انہوں نے، اس مسئلہ کا حل یہ بتایا کہ:۔

> میری آرزو یہ ہے کہ پنجاب، صوبہ سرحد، سندھ اور بلوچستان کو ملا کر ایک واحد ریاست قائم کی جائے۔ ...... مجھے تو یہ نظر آتا ہے کہ شمال مغربی ہندوستان میں ایک متحدہ اسلامی ریاست کا قیام کم از کم اس علاقہ کے مسلمانوں کے مقدر میں لکھا جا چکا ہے [1]۔

اس مملکت کے قیام سے ہو گا کیا؟ فرمایا کہ:۔

> اس سے اسلام کو اس امر کا موقعہ ملے گا کہ وہ ان اثرات سے آزاد ہو کر جو عربی ملوکیت کی وجہ سے اب تک اس پر قائم ہیں، اس جمود کو توڑ ڈالے جو اس کی تہذیب و تمدن، شریعت اور تعلیم پر صدیوں سے طاری ہے۔ اس سے نہ صرف ان کی صحیح معنوں میں تجدید ہو سکے گی بلکہ وہ زمانۂ حال کی روح سے بھی قریب تر ہو جائیں گے۔

---

[1] بعد میں اس میں بنگال کا حصہ بھی شامل کر دیا گیا تھا۔

آپ ان الفاظ پر ایک بار پھر غور کیجئے کہ اس مملکت کے قیام سے :-

اسلام کو اس امر کا موقعہ ملے گا کہ وہ ان اثرات سے آزاد ہو جائے گا جو عربی ملوکیت کی وجہ سے اس پر اب تک قائم ہیں۔

یہ اثرات کیا ہیں؟ وہی جو ہم نے ملوکیت کی وجہ سے اسلام میں پیدا شدہ تبدیلیوں کے ضمن میں بیان کئے ہیں اور جنہیں سمٹے ہوئے الفاظ میں یوں کہا جائیگا کہ جن کی وجہ سے اسلام ، دین کے بجائے مذہب بن گیا تھا اور اس طرح "دین اور دنیا" میں ثنویت پیدا ہو گئی تھی ۔ جس کی وجہ سے مذہبی پیشوائیت کا وجود عمل میں آ گیا تھا ۔ اسی حقیقت کو انہوں نے ، اپنے خطبات تشکیلِ جدید (کے چھٹے خطبہ) میں ، سعید حلیم پاشا (مرحوم) کی ہم نوائی میں یوں بیان کیا تھا کہ :-

اندریں حالات ہمارے لئے کشادِ کار کی ایک ہی راہ ہے ۔ اور وہ یہ کہ آئینۂ اسلام پر غیر اسلامی زنگ کی جو سخت اور درشت تہیں جم گئی ہیں ، اور جس کی وجہ سے اس کا حرکیاتی اور ارتقائی نظریہ یکسر جامد ہو کر رہ گیا ہے ، انہیں کھرچ کھرچ کر الگ کیا جائے ، اور حریت ، سالمیت اور مساوات کی حقیقی اقدار کو از سرِ نو زندہ کرکے ، ان کی بنیادوں پر اپنے اخلاقی ، عمرانی اور سیاسی نظام کی تشکیلِ جدید کی جائے جو حقیقی اسلام کی سادگی اور آفاقیت کا آئینہ دار ہو۔

علامہ اقبالؒ کے بعد ، یہ شمع قائدِ اعظمؒ ، محمد علی جناحؒ کے ہاتھ میں آئی تو وہ بھی تحریکِ پاکستان کے دوران ، اور حصولِ پاکستان کے بعد بھی ، اسی پیغام کو دہراتے چلے گئے ۔ اس سلسلہ میں ہم تفصیل کے ساتھ اس پمفلٹ میں لکھ چکے ہیں جو "قائدِ اعظمؒ اور قرآن مجید" کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے ۔

قائدِ اعظمؒ کا مسلک

موضوع کے تسلسل کی جہت سے ، ہم اس میں سے صرف ایک اقتباس کو یہاں دہرا دینا ضروری سمجھتے ہیں ۔ اور یہ اقتباس ان کے اس انٹرویو سے متعلق ہے جو ۱۹۴۱ء میں ، حیدر آباد (دکن) کی عثمانیہ یونیورسٹی کے طلباء سے ان سے لیا تھا ۔ انہوں نے قائدِ اعظمؒ سے پوچھا کہ ——— "مذہب اور مذہبی حکومت کے لوازم کیا ہیں؟" ——— اس کے جواب میں انہوں نے فرمایا :-

جب میں انگریزی زبان میں مذہب کا لفظ سنتا ہوں تو اس زبان اور قوم کے محاورہ کے مطابق لامحالہ میرا ذہن خدا اور بندے کی باہمی نسبت اور رابطہ کی طرف منتقل ہو جاتا ہے ۔ لیکن میں بخوبی جانتا ہوں کہ اسلام اور مسلمانوں کے نزدیک مذہب کا یہ محدود اور مقید مفہوم یا تصور نہیں ہے ۔ میں نہ کوئی مولوی ہوں ، نہ ملّا ، نہ مجھے دینیات میں مہارت کا دعویٰ ہے ۔ البتہ میں نے قرآن مجید اور قوانینِ اسلامیہ کے مطالعہ کی اپنے طور پر کوشش کی ہے ۔ اس عظیم الشان کتاب کی تعلیمات میں انسانی زندگی کے ہر باب کے متعلق ہدایات موجود ہیں ۔ زندگی کا روحانی پہلو ہو یا معاشرتی ، سیاسی ہو یا معاشی ، غرضیکہ کوئی شعبہ ایسا نہیں جو قرآنی تعلیمات کے احاطہ سے باہر ہو ۔ قرآنِ کریم کی اصولی ہدایات اور سیاسی طریقِ کار نہ صرف مسلمانوں کے لئے بہترین ہیں بلکہ اسلامی حکومت میں غیر مسلموں کے لئے حسنِ سلوک اور آئینی حقوق کا جو حصہ ہے ، اس سے بہتر تصور ناممکن ہے ۔

آپ نے دیکھا کہ اس میں "مذہب اور دین" کے فرق کو کس مقلتانہ انداز سے واضح کیا گیا ہے۔ اس کے بعد ان طلبا نے کہا کہ :۔

جب آپ اسلامی اصول کے نصب العین اور طریق کار دونوں میں بہترین حکومت کا یقین رکھتے ہیں اور اجمالاً یہ بھی کہتے ہیں کہ مسلمانوں کو خود مختار علاقے اس لئے مطلوب ہیں کہ وہاں وہ اپنے ذہنی میلانات اور تصورات زندگی کو بلا روک ٹوک بروئے کار اور بہ درجہ ترقی لا سکیں، تو پھر اس میں کونسا امر مانع ہے کہ مسلم لیگ زیادہ تفصیل اور توضیح کے ساتھ اپنی جدوجہد کی مذہبی تعبیر و تشریح کر دے؟

سوال آپ نے دیکھ لیا۔ اب اس کے جواب کو بڑے غور سے سنئے۔ فرمایا :۔

دقت یہ ہے کہ جب اس جدوجہد کو مذہب سے تعبیر کیجئے تو ہمارے علماء کی ایک جماعت، بغیر اس کے سمجھنے کے کہ کام کی نوعیت، تقسیم عمل اور اس کے اصل حدود کیا ہیں، ان امور کو صرف چند مولویوں کا اجارہ خیال کر لیتی ہے، اور اپنے حلقہ سے باہر اہلیت و استعداد کے باوجود مجھ میں یا آپ میں (یعنی ان کے اپنے سوا کسی اور میں) اس خدمت کے سرانجام دینے کی کوئی صورت نہیں دیکھتی۔ حالانکہ اس منصب کی بجا آوری کے لئے جن اجتہادی صلاحیتوں کی ضرورت ہے، انہیں میں، ان مولوی صاحبان میں (اِلّا ماشاءاللہ) نہیں پاتا۔ (اور مشکل اندر مشکل یہ کہ) وہ اس مشن کی تکمیل میں دوسروں کی صلاحیتوں سے کام لینے کا سلیقہ بھی نہیں رکھتے۔

اس سے بھی ان کا مطلب یہی تھا کہ مطالبۂ پاکستان کی بنیاد اس حقیقت پر ہے کہ ہم ایک ایسا خطۂ زمین چاہتے ہیں، جہاں اسلام بہ حیثیت دین کے کارفرما ہو، اور ہماری مذہبی پیشوائیت، اسلام کو مذہب ہی سمجھتی ہے۔ دین، ان کی سمجھ میں نہیں آتا۔ دین میں مذہبی پیشوائیت کا وجود ہی نہیں ہوتا۔ اسی لئے انہوں نے، اس سے بھی پہلے، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں، ۵ر فروری ۱۹۳۸ء کو تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ :۔

لیگ نے جو (اہم) کام کیا ہے یہ ہے کہ اس نے تمہیں مسلمانوں کے رجعت پسند طبقہ سے نجات دلا دی ہے اور یہ خیال عام کر دیا ہے کہ مفاد پرست طبقہ قوم کا غدار ہے۔ اس نے تمہیں اس ناقابل قبول طبقہ کے چنگل سے آزاد کرا دیا ہے۔ جنہیں مولوی یا مولانا کہتے ہیں۔

(تقاریر جناح ؒ۔ جلد اوّل۔ ص ۴۸)

اس سے مراد، تھیاکریسی کا خاتمہ کرنا تھا۔ آپ کو یاد ہوگا کہ انہوں نے، تشکیل پاکستان کے بعد، بہ حیثیت گورنر جنرل اہلِ امریکہ کے نام اپنے براڈ کاسٹ میں کہا تھا کہ :۔

یہ مسلّمہ بات ہے کہ پاکستان میں کسی صورت میں بھی تھیاکریسی رائج نہیں ہوگی جس میں حکومت مذہبی پیشواؤں کے ہاتھ میں دے دی جاتی ہے کہ وہ (بزعم خویش) خدائی مشن کو پورا کریں۔

(تقاریر بہ حیثیت گورنر جنرل۔ ص ۶۵)

ان تصریحات سے واضح ہے کہ تحریکِ پاکستان کا مقصد ایک ایسی مملکت کا قیام تھا جس میں اسلام، دین کی حیثیت

سے کارفرما ہوسکے۔ ظاہر ہے کہ اس تحریک اور مطالبہ کی مخالفت مذہبی پیشوائیت کی طرف سے لازمی تھی۔ اس لئے کہ اس قسم کی مملکت میں ان کا اقتدار باقی نہیں رہتا تھا۔ وہ سیکولر اسٹیٹ کے حق میں تھے جس میں مذہبی امور، علماء کی تحویل میں رہتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ تحریک کے دوران کش مکش، درحقیقت مذہب اور دین کی کشمکش تھی۔ نیشنلسٹ علماء کا مؤقف یہ تھا کہ آزاد ہندوستان میں مسلمانوں کو مذہبی آزادی حاصل ہوگی۔ لہٰذا مسلمانوں کے لئے ایک الگ مملکت کے قیام کی کوئی ضرورت نہیں۔ اس گروہ کے سرخیل' جمعیت العلماء ہند کے صدر، اور دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث' مولانا حسین احمد مدنی (مرحوم) تھے۔ ان کا ارشاد تھا کہ :-

مطالبۂ پاکستان کی مخالفت

ایسی جمہوری حکومت جس میں ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی سب شامل ہوں، حاصل کرنے کے لئے سب کو متفقہ کوشش کرنی چاہیئے ایسی مشترکہ آزادی، اسلام کے اصول کے عین مطابق ہے۔ اور اسلام اس آزادی کی اجازت دیتا ہے۔

(زمزم - مورخہ ۷ رجولائی ۱۹۳۸ء)

مذہبی آزادی کے متعلق وہ فرماتے تھے کہ :-

کانگریس میں ہمیشہ ایسی تجاویز آتی رہتی ہیں اور پاس ہوتی رہتی ہیں جن کی وجہ سے مذہب اسلام کے تحفظ اور وقار کو ٹھیس نہ لگے۔　　(مولانا مدنی کا پمفلٹ - "متحدہ قومیت اور اسلام" - ص۲۱)

وہ کہا کرتے تھے کہ :-

جواہر لعل نہرو ہندو ہے۔ اس نے کبھی نہیں کہا کہ میں مسلمان ہوں۔ اس کے باوجود وہ مسلمانوں کی حفاظت چاہتا ہے۔　　(طلوعِ اسلام - اکتوبر ۱۹۶۴ء - ص۲۳)

ہم نے اوپر کہا ہے کہ ان حضرات کے نزدیک سیکولرازم عین مطابق اسلام ہے اور علماء دیوبند اسی کے لئے کوشاں رہے تھے۔ ہندوستان کے مشہور نیشنلسٹ اخبار، مدینہ (بجنور) کی ۱۷ راپریل ۱۹۶۳ء کی اشاعت میں مولانا اسرار احمد آزاد (دیوبندی) کا ایک مقالہ شائع ہوا تھا جس میں کہا گیا تھا کہ :-

یہ الزام بے بنیاد ہے کہ علماء ہند اس ملک میں اسلامی حکومت کے لئے کوشاں رہے ہیں۔ دارالعلوم دیوبند سے تعلق رکھنے والے علماء نے کم از کم اس صدی کے آغاز سے ہندوستان میں جمہوری اور سیکولر حکومت کے قیام کو اپنا واضح نصب العین قرار دے لیا تھا۔

اس کے بعد، اس حقیقت کے سمجھنے میں کوئی شبہ ہی نہیں رہ جاتا کہ مذہبی پیشوائیت کی طرف سے تحریکِ پاکستان کی مخالفت درحقیقت، دین اور مذہب۔ سیکولر نظام اور اسلامی نظام یا خلافت اور ملوکیت کی جنگ تھی۔ مذہبی پیشوائیت دین کے تسلط کو برداشت ہی نہیں کرسکتی۔

خلافِ اسلام

ہم نے اوپر کہا ہے کہ نیشنلسٹ علماء، مسلمانوں کے لئے ایک جداگانہ مملکت کی ضرورت ہی نہیں سمجھتے تھے۔ اتنا ہی نہیں کہ وہ اس کی ضرورت نہیں سمجھتے تھے۔ وہ اس کے لئے کوشش کرنا خلافِ اسلام قرار دیتے تھے۔ اس زمانے میں' علامہ اقبالؒ۔ قائداعظمؒ اور تحریکِ مسلم لیگ کے خلاف اِن علماء نے جو فتوے شائع کئے تھے وہ آج بھی تاریخ کے صفحات میں محفوظ ہیں۔ مثلاً " تجانب اہل السنۃ

عن اهل الفتنة" بریلوی حضرات کی مایۂ ناز کتاب ہے۔ (اس وقت ہمارے سامنے اس کا وہ ایڈیشن ہے جو محمدی کتب خانہ۔ احمد پور شرقیہ۔ بہاول پور کی طرف سے ۱۳۶۱ھ میں شائع ہوا تھا)۔ اس میں علامہ اقبالؒ کے خلاف صفحات پر صفحات سیاہ کرنے کے بعد تحریر ہے:۔

ڈاکٹر صاحب کی زبان پر ابلیس بول رہا ہے۔ (ص ۳۴۰)

اور:۔

ڈاکٹر صاحب کے مذہب کو سچے دین، اسلام کے ساتھ کیا تعلق ہے؟ (ص ۳۴۱)

اس میں، قائدِاعظمؒ کے متعلق کہا گیا ہے:۔

بحکمِ شریعت مسٹر جناح اپنے ان عقائدِ کفریہ قطعیہ یقینیہ کی بنا پر قطعاً مرتد اور خارج از اسلام ہے۔ اور جو شخص اس کے کفروں پر مطلع ہونے کے بعد اسکو مسلمان جانے یا اسے کافر نہ مانے یا اس کے کافر مرتد ہونے میں شک رکھے یا اس کو کافر کہنے میں توقف کرے وہ بھی کافر۔ مرتد اور شر الانام ہے اور بے توبہ مرا تو مستحق لعنت عزیز علام۔ (ص ۱۲۲)

اسی فرقہ کے ایک ممتاز عالم، مولانا اولادِ رسول نے ایک رسالہ "الجوابات السنیہ" شائع کیا تھا۔ اس میں حزب الاحناف (لاہور) کے مولانا ابوالبرکات سید احمد صاحب کا یہ فتویٰ درج تھا کہ:۔

لیگ کی حمایت کرنا۔ اس میں چندے دینا۔ اس کا ممبر بننا۔ اس کی اشاعت و تبلیغ کرنا۔ منافقین و مرتدین کی جماعت کو فروغ دینا ہے۔ (بحوالہ پمفلٹ "دھماکہ" شائع کردہ۔ انجمن خدام التوحید والسنۃ۔ ساہیوال۔ ص ۱۷)

اکتوبر ۱۹۴۵ء میں مولانا حسین احمد مدنی (مرحوم) نے مسلم لیگ میں مسلمانوں کی شرکت کو حرام، اور قائدِاعظمؒ کو "کافرِاعظم" قرار دیتے ہوئے ایک فتویٰ شائع کیا جس کا مدلل جواب، مولانا شبیر احمد عثمانی (مرحوم) نے تحریر فرمایا اور اسے جریدہ "رہبر دکن" (حیدر آباد۔ دکن) نے اپنی اشاعت بابت ۲۹ر اکتوبر ۱۹۴۵ء میں شائع کیا۔ (بحوالہ "تحریکِ پاکستان اور نیشنلسٹ علماء"۔ ص ۱۰۱۲)۔

مجلسِ احرارِ اسلام کے ایک ممتاز لیڈر (مولانا) مظہر علی اظہر کا یہ رسوائے عالم شعر کیسے بھولا جا سکتا ہے کہ:۔

اک کافرہ کے واسطے اسلام کو چھوڑا یہ قائدِاعظم ہے کہ ہے کافرِاعظم!

حالانکہ واقعاتی اعتبار سے بھی یہ الزام سراسر کذب و افترا تھا۔ قائدِاعظمؒ نے اپنی (پارسی) بیوی سے اس کے مسلمان ہونے کے بعد شادی کی تھی۔

اسی مجلسِ احرار کی ورکنگ کمیٹی نے اپنے اجلاس منعقدہ ۲۹ر مارچ ۱۹۴۶ء میں ایک قرارداد پاس کی جس میں کہا گیا تھا کہ:۔

یہ اجلاس ایک بار پھر اعلان کرتا ہے کہ مسلم لیگ کی قیادت قطعی غیر اسلامی ہے۔ (تحریکِ پاکستان اور نیشنلسٹ علماء۔ ص ۵۷۳)

اس مخالفت میں، ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کا نام سرفہرست آتا ہے۔ ایک تو اس لئے کہ ان جماعتوں یا افراد کی طرف سے اس قسم کے فتاویٰ یا قرار دادیں وقتاً فوقتاً شائع ہوتی تھیں لیکن مودودی صاحب نے اِس مخالفت کو اپنی زندگی کا مشن قرار دے رکھا تھا اور وہ تحریکِ پاکستان کے آخری دنوں تک اسے "غیر اسلامی" قرار دیتے رہے تھے۔ دوسرے اس لئے کہ ان مخالف فرقوں کے بعض علماء بعد میں تحریکِ پاکستان کے مؤید اور مسلم لیگ میں شریک بھی ہو گئے تھے لیکن مودودی صاحب تشکیلِ پاکستان کے بعد تک بھی مسلم لیگی رہنماؤں کو ہدفِ طعن و تشنیع بنانے سے نہیں رُکے۔ وہ اب بھی اعلان کرتے رہتے ہیں کہ تحریکِ پاکستان کی صفِ اول کے راہ نما سچے اور حقیقی مسلمان نہیں تھے۔

ان تمام مخالفین میں، عقائد، مشارب، مسالک کے اختلاف کے باوجود، ایک چیز قدرِ مشترک تھی۔ اور وہ تھی تقسیمِ ہند کی مخالفت۔ بالفاظِ دیگر، مسلمانوں کی الگ مملکت کے قیام کی مخالفت۔ دیگر مخالفین اپنی مخالفت کا کھلے الفاظ میں اعلان کرتے تھے لیکن مودودی صاحب کا انداز ان سے مختلف تھا۔ انہوں اپریل ۱۹۴۷ء میں، ٹونک میں (جماعتِ اسلامی کے اجلاس میں) کہا کہ:-

> یہ لوگ ہندوستان کے ایک ذرا سے کونے میں پاکستان بنانے کو اپنا انتہائی مقصد بنائے ہوئے ہیں لیکن اگر یہ فی الواقعہ خلوصِ قلب سے اسلام کی نمائندگی کے لئے کھڑے ہو جائیں تو سارا ہندوستان پاکستان بن سکتا ہے۔ اور اس میں لادینی جمہوری حکومت یا عوامی پارلیمنٹری حکومت نہیں بلکہ خالص خدا کی حکومت، کتاب و سنت کے اصولوں پر قائم ہو سکتی ہے۔
>
> (روئداد جماعتِ اسلامی۔ حصہ پنجم۔ صـ ۶۵)

آپ نے دیکھا کہ بات تو یہ بھی وہی کہہ رہے تھے جو مطالبۂ پاکستان کے دیگر مخالفین کہتے تھے، لیکن ان کا انداز مختلف تھا۔ مزید برآں یہ اگر تقسیمِ ہند کو بادلِ نخواستہ قبول بھی کرتے تھے تو اس شرط کے ساتھ کہ ہندوستان کے ساتھ کنفیڈریشن قائم کر لی جائے جس میں اہم شعبے مرکز کی تحویل میں رہیں۔ یہی بات اگلے دنوں مفتی محمود صاحب نے بھی کہی تھی۔ انہوں نے ایک انٹرویو میں کہا تھا کہ ہم نے نظریۂ پاکستان کی مخالفت کی تھی کیونکہ ہم متحدہ ہندوستان میں صوبجاتی آزادی مسلمانوں کے لئے زیادہ مفید خیال کرتے تھے۔ (نوائے وقت۔ ۲۰ ستمبر ۱۹۷۷ء)۔ آپ نے غور فرمایا کہ یہ تمام حضرات مسلمانوں کے لئے ایک الگ مملکت کے بہرحال مخالف تھے۔

بہرحال یہ تھی وہ کشمکش جو تحریکِ پاکستان کے دوران غیر منقسم ہندوستان میں جاری رہی۔ یعنی، علامہ اقبالؒ اور قائدِ اعظمؒ کا مقصد اسلام کو پھر سے دین کی حیثیت سے قائم کرنا تھا اور ان مذہبی پیشواؤں کا مقصد اسلام کو مذہب کی حیثیت سے جاری رکھنا جس میں امورِ مملکت سیکولر انداز سے طے پاتے ہیں، اور مذہبی امور علماء کی تحویل میں رہتے ہیں۔ یہاں پہنچنے کے بعد ان کی کوششیں ختم نہیں ہو گئیں۔ بدستور جاری ہیں۔ اور اب وہ ... بہ تقاضائے حالات، شدت اختیار کر گئی ہیں۔ یعنی انہوں نے پاکستان میں سیکولر نظام رائج کرنے کے لئے متحدہ محاذ قائم کر لیا ہے۔

ہم اچھی طرح محسوس کرتے اور سمجھتے ہیں کہ ان الفاظ سے آپ یقیناً چونک اٹھیں گے۔ آپ کہیں گے کہ یہ حضرات "نظامِ مصطفیٰ" قائم کرنے کے لئے مصروفِ جہاد ہیں اور آپ کہہ رہے ہیں کہ ان کی انتہائی تگ و تاز اُسی قسم کا سیکولر اسلام رائج کرنے کے لئے ہے جس قسم کا اسلام یہ حضرات غیر منقسم ہندوستان میں جاری رکھنا چاہتے تھے اور جس کی اجازت ہندو بھی دیتا تھا۔ آپ کی یہ حیرت بالکل بجا ہے۔ اس لئے کہ یہ حضرات کبھی واضح طور پر بتاتے نہیں کہ "نظامِ مصطفیٰ" کا عملی مفہوم کیا ہے، اور آپ حضرات ان سے یہ پوچھتے نہیں اور محض ایک اصطلاح سے مطمئن ہو رہے ہیں کہ یہاں اسلامی نظام رائج ہو جائے گا۔ ہماری آپ سے درخواست ہے کہ ذیل میں جو کچھ پیش کیا جاتا ہے، آپ براہِ کرم اسے پورے غور و فکر سے سمجھنے کی کوشش فرمائیں۔

یہ ظاہر ہے کہ:-

نظامِ مصطفیٰ کی خصوصیات

(۱) "نظامِ مصطفیٰ" سے بہر نوع مراد، دینِ خداوندی کا وہ عملی نظام ہے جسے حضور نبی اکرم ؐ نے قائم فرمایا تھا۔

(۲) اس نظام کی بنیادی خصوصیت یہ تھی کہ:-

(ا) اس میں تمام مسلمان، امتِ واحدہ تھے۔ اس میں نہ مذہبی فرقے تھے، نہ سیاسی جماعتیں۔ دین عطا کرنے والے خدا نے، نظام قائم کرنے والے (جناب محمد) مصطفیٰ (صلے اللہ علیہ وسلم) سے واضح الفاظ میں کہہ دیا تھا کہ:-

إِنَّ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِي شَيْءٍ ۔ (۶/۱۵۹)

جو لوگ اپنے دین میں تفرقہ پیدا کرکے، فرقوں اور پارٹیوں میں بٹ جائیں۔ اے رسول! تیرا ان سے کوئی واسطہ نہیں۔

ظاہر ہے کہ جن لوگوں کا مصطفیٰ (ؐ) سے کوئی تعلق واسطہ نہ رہے، انہیں نظامِ مصطفیٰ سے کیا واسطہ ہو سکتا ہے!

(ب) اس نظام میں پرسنل لاز اور پبلک لاز میں کوئی تفریق نہیں تھی۔ نہ ہی مختلف فرقوں کے پرسنل لاز الگ الگ تھے۔ ایک ضابطۂ قوانین تھا جس کا اطلاق تمام مسلمانوں پر یکساں ہوتا تھا۔

(ج) اس نظام کی پارلیمان (مجلسِ شوریٰ) میں نہ حزبِ اقتدار تھی نہ حزبِ اختلاف۔ اس میں تمام ارکان جسدِ واحد کی طرح مصروفِ عمل رہتے تھے۔

آپ ان حضرات سے، جو "نظامِ مصطفیٰ" کے قیام کے داعی ہیں، پوچھئے کہ جو کچھ اوپر کہا گیا ہے وہ صحیح ہے یا غلط! ـــــ کیا نظامِ مصطفیٰ ؐ کا یہی نقشہ تھا یا کوئی اور؟

اب اس نظام کو دیکھئے جس کے قائم کرنے کے لئے یہ حضرات کوشاں ہیں۔ اس نظام میں۔

(ا) اُمت مختلف مذہبی فرقوں اور سیاسی پارٹیوں میں بٹی ہوئی ہے۔

(۲) اس میں پرسنل لاز کو پبلک لاز سے الگ کر دیا گیا ہے اور ہر فرقہ کو اجازت ہے کہ وہ ـــــ پرسنل لاز کے معاملہ میں اپنی اپنی فقہ پر عمل کرے۔ جہاں تک پبلک لاز کا تعلق ہے اس کا ذکر بعد میں آئے گا۔ وہیں سے یہ حقیقت بھی سامنے آ جائے گی کہ اس تمام تگ و تاز کے نتیجہ میں مملکت میں سیکولر نظام قائم ہوگا۔

(۳) اس نظام میں حزبِ اقتدار اور حزبِ مخالف ایک دوسرے سے برسرِ پیکار ہوں گے۔

آپ اُس نظامِ مصطفیٰؐ جسے حضور نبی اکرمؐ نے قائم فرمایا تھا۔ اور اس نظامِ مصطفیٰؐ کا جسے یہ حضرات قائم کرنا چاہتے ہیں، آمنے سامنے رکھ کر موازنہ کیجئے اور پھر خود ہی فیصلہ کیجئے کہ کیا یہ دونوں نظام ایک ہیں، یا ایک دوسرے کی ضد!

پبلک لاز کا معاملہ

اب آیئے پبلک لاز کی طرف جس کی بنیاد پر ایک آئینی حکومت کی عمارت استوار ہوتی ہے۔ اس حقیقت کے سمجھنے کے لئے کسی افلاطون کے دماغ کی ضرورت نہیں کہ پبلک لاز انہیں کہتے ہیں جن کا اطلاق مملکت کے تمام باشندوں پر یکساں ہو۔ یعنی وہ ہر ایک پر یکساں لاگو ہوں۔ کوئی جماعت یا گروہ تو ایک طرف، اگر ایک فرد اپنے لئے کوئی ایک لا (قانون) بھی مملکت کے پبلک لاز سے الگ اختیار کر کے اس پر عمل پیرا ہو جائے، تو اسے مملکت کے خلاف بغاوت قرار دیا جائے گا۔ "بائیں طرف چلو" (KEEP TO THE LEFT) مملکت کا ادنیٰ ترین پبلک لا ہے۔ اگر کوئی شخص کہے کہ میں اس قانون کو نہیں مانتا۔ میں "دائیں طرف چلو" کے قانون کو صحیح سمجھتا ہوں اور اسی پر چلوں گا تو اسے قانون شکنی کا مجرم ہی نہیں، باغی قرار دیا جائے گا۔ اس سے آپ پبلک لاز کی یکسانیت کی اہمیت کا اندازہ لگا لیجئے۔ اس یکسانیت کے بغیر کسی مملکت کا وجود ہی باقی نہیں رہ سکتا۔

اس کے بعد آیئے نظامِ مصطفیٰؐ کے داعیوں کی طرف سے پبلک لاز کی تدوین کے سوال کے حل کی طرف۔ یعنی اس سوال کی طرف کہ ان لاز کی تدوین کی بنیاد (BASIS) کیا ہوگی ——— اس سوال کی تاریخ بڑی دلچسپ ہے۔

۱۹۵۱ء کا ذکر ہے کہ ملک کے مختلف فرقوں کے اکتیس علماء نے ایک بیان شائع کیا جس میں کہا گیا کہ یہ مشہور کیا جاتا ہے کہ مختلف فرقوں کے علماء کے باہمی اختلافات کی وجہ سے، مملکت کے لئے متفق علیہ ضابطہ، قوانین مرتب نہیں ہو سکتا۔ یہ لیجئے، ملک کے مختلف فرقوں کے نمائندوں کا بیان جس میں وہ اس مسئلہ پر متفق ہو گئے ہیں! ——— کس بات پر متفق ہو گئے ہیں؟

کتاب وسنت

اس بات پر کہ مملکت کے ضابطہ قوانین کی بنیاد "کتاب وسنت" ہو گی۔ مودودی صاحب نے اس متفق علیہ بنیاد کا خاص طور پر چرچا کیا۔

ہمارے ہاں مشکل یہ ہے کہ صدیوں کے جمود و تعطل سے قوم میں (کم از کم مذہب کے معاملہ میں) غور و فکر کی صلاحیتیں مفقود ہو چکی ہیں اور وہ یکسر جذباتی ہو گئی ہے۔ اس پر طرہ یہ کہ مذہبی پیشوا، قوم کے نازک ترین جذبات کو مشتعل کرتے رہتے ہیں جس سے رہی سہی غور و فکر کی صلاحیت بھی معطل ہو جاتی ہے۔ اگر قوم غور و فکر سے کام لیتی تو ان حضرات سے بآسانی پوچھ سکتی تھی کہ ان فرقوں میں سے کوئی بھی "کتاب وسنت" کا منکر نہیں۔ جب "کتاب وسنت" کے اقرار کے باوجود یہ مختلف فرقوں میں بٹ رہے ہیں تو اسی کتاب وسنت کی رو سے ایک ایسا ضابطہ قوانین کس طرح مرتب ہو سکے گا، جسے یہ سب اسلامی تسلیم کر لیں۔ ان کی اپنی اپنی فقہ کہاں جائے گی، کیا یہ اُنہیں چھوڑ دیں گے؟ ان سے کسی نے اس قدر پیش پا افتادہ سوال بھی نہ پوچھا اور سب مطمئن ہو گئے کہ اسلامی جمہوریہ پاکستان کے لئے

اسلامی قوانین کے مرتب ہو جانے کا طریق طے ہو گیا ہے۔ اس کے بعد ان حضرات نے شور مچانا شروع کر دیا کہ حکومت اسلامی قوانین نافذ نہیں کرتی۔ اربابِ اقتدار فریب کار ہیں۔ اسلامی قوانین نافذ کرنے کی ان کی نیت ہی نہیں۔ چنانچہ اس حربے سے ہر حکومت کے خلاف نفرت پھیلانے کا موقعہ ہاتھ آ گیا۔

یہ طلوعِ اسلام کی "بدقسمتی" ہے کہ اس کی سمجھ سوجھ کی صلاحیتیں سلب نہیں ہوئیں۔ (یہ درحقیقت قرآن مجید کی روشنی سے استفادہ کا تصدق ہے۔ فالحمد للہ علیٰ ذالک)۔ اس نے جرأت کر کے کہہ دیا کہ قوم کو یہ مقدس فریب دیا جا رہا ہے۔ کتاب و سنت کی بنیاد پر کوئی ایسا ضابطۂ قوانین مرتب نہیں ہو سکے گا جسے تمام فرقے متفقہ طور پر اسلامی تسلیم کر لیں۔ یہ بات مبنی برحقیقت تھی لیکن چونکہ اس سے ان حضرات کی ساری اسکیم ناکام رہ جاتی تھی اس لئے انہوں نے اپنے مخصوص حربہ سے کام لیا اور پراپیگنڈہ شروع کر دیا کہ طلوعِ اسلام منکرِ حدیث ہے۔ منکرِ سنت ہے۔ منکرِ شانِ رسالت ہے۔ اور نہ معلوم کیا کیا ہے! ایک تو "سنت" جیسا مقدس تصور، دوسرے طلوعِ اسلام کے خلاف مسلسل اور منظم پروپیگنڈہ ——— سارا ملک اس سے متاثر ہو گیا۔ اور اصل مسئلہ کی طرف ——— توجہ دینے کا کسی کو خیال تک نہ آیا۔

یہ ممکن نہیں

بیس سال تک یہ حضرات اس "مقدس جہاد" میں مصروف رہے۔ تا آنکہ ۱۹۷۰ء میں خود مودودی صاحب کو اعلان کرنا پڑا کہ:۔

کتاب و سنت کی رُو سے پبلک لاء کی کوئی ایسی تعبیر ممکن نہیں جو شیعہ۔ اہلِ حدیث اور حنفیوں کے نزدیک متفقہ طور پر اسلامی قرار پا سکے۔ (ایشیا۔ مورخہ ۲۳ اگست ۱۹۷۰ء)

آگے بڑھنے سے پیشتر اس دلچسپ حقیقت کو سامنے لائیے۔ مودودی صاحب نے یہاں اعتراف کیا ہے کہ کتاب و سنت کی بنا پر کوئی ایسا ضابطۂ قوانین مرتب نہیں ہو سکتا جسے تمام فرقے اسلامی تسلیم کر لیں۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے ۱۹۷۰ء ہی میں، جو انتخابی منشور شائع کیا اس کے دیباچہ میں کہا گیا کہ:۔

جماعتِ اسلامی کے پیشِ نظر پاکستان کو ایک ایسی ریاست بنانا ہے جو قرآن و سنت کے اتباع کی پابند ہو اور خلافت راشدہ کے نمونے کی پیرو ہو۔ (ایشیا۔ ۴ جنوری ۱۹۷۰ء)

حتےٰ کہ ۱۹۷۳ء کے آئین میں بھی یہ شق درج کرا دی گئی کہ ملک کا کوئی قانون کتاب و سنت کے خلاف نہیں ہوگا۔ یعنی جس چیز کو یہ حضرات خود ناممکن العمل قرار دیتے تھے اسے آئین کا جزو بنا دیا گیا۔ یہ جو آپ دیکھتے ہیں کہ قانون سازی کے سلسلہ میں نظریاتی کونسل تک کا کوئی قدم آگے نہیں بڑھتا تو اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ان کے ذمہ ایسا کام لگا دیا گیا ہے جو ناممکن العمل ہے۔

بہرحال جب مودودی صاحب نے اعلان کیا کہ کتاب و سنت کی رو سے کوئی ایسا ضابطۂ قوانین مرتب نہیں ہو سکتا تو فطرتاً خیال پیدا ہوا کہ اب یہ کوئی ایسا متبادل فارمولا پیش کریں گے جس کی رو سے ایسا ضابطۂ قوانین مرتب ہو سکے۔ لیکن انہوں نے کوئی متفق علیہ متبادل فارمولا پیش کرنے کے بجائے ایسا حل پیش فرمایا جس سے ملک میں مزید انتشار پھیل جائے۔ انہوں نے اعلان فرمایا کہ چونکہ ملک کی اکثریت فقہ حنفی کی پیرو ہے اس لئے اس فقہ کو مملکت کے قانون کی حیثیت سے نافذ کر دیا جائے اور اس کی اطاعت ہر فرقہ

پر لازم ہو۔

اس تجویز پر ذرا بنگاہِ تعمق غور کیجئے۔ شیعہ حضرات تو ایک طرف، خود سنیوں میں اہلِ حدیث اور اہلِ فقہ کی جنگ ہزار برس سے چلی آ رہی ہے۔ جس کا مودودی صاحب کو بخوبی علم ہے۔ لیکن اس کے باوجود انہوں نے یہ تجویز پیش کر دی۔ جیسا کہ ظاہر ہے، اس تجویز کے خلاف، اہلِ حدیث حضرات کی طرف سے مخالفت کا طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ انہوں نے کہا کہ اگر ایسا کیا گیا تو ہم ان قوانین کو تسلیم ہی نہیں کریں گے۔ ان کی دلیل معقول تھی۔ یعنی یہ کہ جس فقہ کو ہم اسلامی تسلیم نہیں کرتے، ہم اس کی اطاعت کس طرح کر سکتے ہیں؟ طرفہ تماشا یہ کہ خود مودودی صاحب بھی اپنے آپ کو فقہ حنفی کا پیرو نہیں کہتے۔ وہ اس پر سخت تنقید کرتے رہتے ہیں۔ (ان امور کی تفصیل، طلوعِ اسلام بابت اکتوبر۔ نومبر ۱۹۷۷ء کے صفحات میں دی جا چکی ہے۔ اسے بعد میں اس پمفلٹ کی شکل میں بھی شائع کر دیا گیا ہے جس کا عنوان ہے۔ "نہ اسلامی نہ جمہوری")۔

اہلِ حدیث حضرات نے اس تجویز کے خلاف احتجاج تو کیا لیکن اتنا انہوں نے بھی نہ بتایا کہ ملک کے لئے پبلک لاز کا ایسا ضابطہ مرتب کس طرح کیا جائے جسے تمام فرقے اسلامی تسلیم کریں۔ انہوں نے کہا یہ کہ:-

> ہماری رائے تو یہ ہے کہ اس ملک میں پورے اسلام کو موقع ملنا چاہیئے۔ تمام مکاتبِ فکر کھلے طور پر اپنی اپنی فقہ پر عمل کریں اور لوگ آزادی سے جس مسئلہ میں چاہیں، جس مکتبِ فکر کو پسند کریں، اس پر عمل کریں اور کوئی تعصب نہ ہو۔ اس لحاظ سے یہ ملک دنیا کے لئے ایک مثال ہو کہ اس میں عصبیت کے لئے کوئی جگہ نہ ہو۔ (الاعتصام۔ مورخہ ۲۵ دسمبر ۱۹۶۴ء)

اس سے مترشح ہوتا ہے کہ یہ حضرات "پبلک لاز" کا مفہوم نہیں سمجھ سکے، ورنہ وہ کبھی اس قسم کی تجویز پیش نہ کرتے کہ پبلک لاز کے معاملہ میں بھی (پرسنل لاز کی طرح) مختلف فرقے اپنی اپنی فقہ پر عمل کرتے رہیں۔ کسی مملکت میں، مختلف فرقوں کے لئے پبلک لاز مختلف ہو نہیں سکتے۔

یہ تو رہا اہلِ فقہ اور اہلِ حدیث کا اختلاف۔ خود فقہ حنفی کے پیرؤں میں دو مشہور فرقے ہیں بریلوی اور دیوبندی ـــــ اس فقہ کی تعبیر میں، خود ان فرقوں میں کس قدر اختلاف ہے، اس کا اندازہ اس ایک مثال سے لگائیے کہ جس زمانہ میں مفتی محمود صاحب (دیوبندی) صوبہ سرحد کے وزیرِ اعلیٰ تھے، بریلوی حضرات نے احتجاج کیا تھا کہ:-

> مفتی صاحب دیوبندیت کو مسلّط کرنے کے لئے اپنے اقتدار کو استعمال کر رہے ہیں۔
> (تنظیم اہلِ حدیث۔ مورخہ ۱۹/۱۳ اکتوبر ۱۹۷۲ء)

جہاں تک شیعہ حضرات کا تعلق ہے، وہ نہ صرف یہ کہ فقہ حنفی کو اسلامی تصور نہیں کرتے، وہ سنیوں کے احادیث کے مجموعوں کو بھی اسلام کی صحیح تعبیر قرار نہیں دیتے۔ ان کی اپنی فقہ اور اپنے احادیث کے مجموعے ہیں وہ انہی کو اسلام میں سند مانتے ہیں اور اپنے ائمہ کرام کی سیرت کو اسلام کی عملی شکل قرار دیتے ہیں۔ ان کی شرط یہ ہے کہ:-

> پبلک لاز میں فقہ جعفریہ کو مساویانہ طور پر رکھا جائے۔ (پمفلٹ۔ نہ جمہوری نہ اسلامی۔ صفحہ ۱۱)

انہوں نے بھی الٹی میٹم دے دیا تھا کہ اگر فقہ حنفی کو مملکت کا قانون بنا دیا گیا تو وہ اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہونگے۔

ان حضرات کے یہ اختلافات فقہ تک محدود نہیں۔ یہ ایک دوسرے کو مسلمان ہی نہیں سمجھتے۔ واضح رہے کہ ہمارے نزدیک کسی فرد یا فرقہ کو حق حاصل نہیں کہ کسی فرد یا فرقہ کو کافر اور دائرۂ اسلام سے خارج قرار دے۔ یہ حق صرف اسلامی مملکت کو حاصل ہے۔ یہ اس لئے کہ اسلامی مملکت اُمتِ مسلمہ پر مشتمل ہوتی ہے۔ اور اس بات کا فیصلہ صرف مملکت کر سکتی ہے کہ کون لوگ امتِ مسلمہ میں شامل ہیں اور کون اس سے خارج ——— جو اس سے خارج قرار دیئے جائیں گے ان کا شمار ذمیوں میں ہوگا ——— یعنی وہ غیر مسلم جو اسلامی مملکت کے زیر سایہ زندگی بسر کرتے ہوں۔ یہ ہے ہمارے نزدیک کفر کے فتوے کی حیثیت۔ لیکن یہ حضرات ایک دوسرے کے خلاف بلا تامل و توقف کفر کے فتوے صادر کرتے رہتے ہیں اور اس کثرت سے کہ ان تمام فرقوں میں سے کوئی فرقہ بھی ایسا نہیں جسے کافر نہ قرار دے دیا گیا ہو۔ ہم شیعہ حضرات کو چھوڑ کر (کہ ان جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے، ان کی اپنی الگ فقہ اور احادیث کے الگ مجموعے ہیں)۔ مثال کے طور پر... ان چند فتووں کو ذیل میں درج کرتے ہیں، جو سنیوں کے مختلف فرقوں نے ایک دوسرے کے خلاف عائد کر رکھے ہیں۔ جیسا کہ کہا جا چکا ہے، سنیوں کے دو متمیز فرقے ہیں۔ اہلِ حدیث اور اہلِ فقہ۔ پھر اہلِ فقہ کے دو فرقے ہیں، دیوبندی اور بریلوی ——— اہلِ حدیث کو عرفِ عام میں، وہابی، اور اصطلاحی طور پر غیر مقلد کہا جاتا ہے۔ اور اہلِ فقہ کو مقلدین۔ غیر مقلدین (اہلِ حدیث) کے خلاف، مقلدین (حنفیوں) کا ایک

کفر کے فتوے

فتویٰ ملاحظہ فرمایئے۔

پس تقلید کو حرام اور مقلدین کو مشرک کہنے والا شرعاً کافر بلکہ مرتد ہوا۔

(انتظام المساجد باخراج اہل فتن عن المساجد)

مولوی احمد رضا خان (بانی فرقہ بریلویہ) نے غیر مقلدین کے تمام گروہوں کے نام بنام عقائد لکھ کر فتویٰ صادر فرمایا تھا کہ:-

یہ سب طائفے سب کے سب کافر و مرتد ہیں۔ جو ان کے کفر و عذاب میں شک کرے، وہ خود کافر ہے۔ (حسام الحرمین)

انہوں نے دیوبندیوں کے متعلق خاص طور پر لکھا تھا کہ:-

جو شخص ان کے کفر میں شک کرے، اس سے دور بھاگنا اور اسے اپنے سے دور کرنا۔ اس سے بغض۔ اس کی اہانت۔ اس کا رد فرض ہے اور توقیر حرام اور ہدم اسلام۔ اسے سلام کرنا حرام۔ اس کے پاس بیٹھنا حرام۔ اس کے ساتھ کھانا پینا حرام۔ اس کے ساتھ شادی بیاہ حرام۔ اور قربت زنا خالص۔ اور بیمار پڑے تو اسے پوچھنے جانا حرام۔ مر جائے تو اس کے جنازے میں شرکت، اسے مسلمانوں کا سا غسل کفن دینا حرام۔ اس پر نمازِ جنازہ پڑھنا حرام بلکہ کفر۔ اس کا جنازہ کندھوں پر اٹھانا۔ اس کے جنازے کی مشایعت حرام۔ اسے مسلمانوں کے مقابر میں دفن کرنا حرام۔ اس کی قبر

پر کھڑے ہونا حرام۔ اس کے لئے دعائے مغفرت یا ایصالِ ثواب حرام بلکہ کفر۔

(عرفانِ شریعت - صـ ۳۹ - بحوالہ پمفلٹ، ڈھاکہ، صـ ۹)

یہ ہوئے غیر مقلدین (اہلِ حدیث) کے خلاف مقلدین کے فتوے۔ اب تصویر کا دوسرا رخ دیکھئے۔ نواب صدیق حسن خان (مرحوم - ممتاز اہلِ حدیث) کا فتویٰ ہے کہ:-

مقلدین پر اطلاق لفظ مشرکین کا، اور تقلید پر اطلاق لفظ شرک کا کیا جاتا ہے۔ دنیا میں آجکل اکثر لوگ مقلد پیشہ ہیں۔ وَمَا يُؤْمِنُ أَكْثَرُهُمْ وَهُمْ مُشْرِكِينَ - یہ آیت ان پر بخوبی صادق آتی ہے۔

(اقترب الساعۃ - صـ ۱۶)

صرف حنفی نہیں سب کے سب:-

چاروں اماموں کے پیرو، اور چاروں طریقوں کے متبع - یعنی حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی - اور چشتیہ قادریہ، نقشبندیہ، مجددیہ - سب لوگ کافر ہیں۔ (جامع الشواہد - صـ ۲)

دیوبندیوں کے خلاف، بریلوی حضرات کا فتویٰ پہلے درج کیا جا چکا ہے۔ اس کے برعکس،

مولوی سید محمد مرتضیٰ صاحب دیوبندی نے، مولوی احمد رضا خان بریلوی کو کافر، اکفر، دجالِ مائتہ حاضرہ، مرتد، خارج از اسلام وغیرہ ثابت کیا ہے۔

(رسالہ ردِ تکفیر علی الفحاش والتنظیر)

"تجانب اہل السنۃ عن اہل الفتنۃ" (جس کا ذکر پہلے آچکا ہے) بریلوی فرقہ کی ایک ممتاز کتاب ہے۔ اس کے قریب پانچ سو صفحات ہیں (اپنے سوا باقی تمام مسلمانوں کے) عقائد کو باطل قرار دینے کے بعد لکھا ہے:-

وہابیہ و دیوبندیہ و قادیانیہ۔ و روافض و نیاچرہ و خاکساریہ و چکڑالویہ و احراریہ و جماعتِ اسلامیہ و آغا خانیہ و بابیہ بہائیہ و وہابیہ غیر مقلدین و وہابیہ نجدیہ و نیچریہ غالیہ و صلحکلیہ غالیہ۔ اپنے عقائد کفریہ، قطعیہ، یقینیہ کی بنا پر بحکمِ شریعت، قطعاً یقیناً اسلام سے خارج اور کفار و مرتدین ہیں جو مدعی اسلام ان میں سے کسی کے قطعی، یقینی کفر پر یقینی اطلاع رکھتے ہوئے بھی اس کو مسلمان کہے، یا اس کے کافر و مرتد ہونے میں شک رکھے یا اس کو کافر و مرتد کہنے میں توقف کرے، وہ بھی یقیناً کافر مرتد ہے۔ اور بے توبہ مرے تو مستحقِ نارِ ابد۔ والعیاذ باللہ الملک الاحد۔ (صـ ۴۵۳)

مودودی صاحب اپنے آپ کو (تصریحاً) کسی فرقہ سے وابستہ قرار نہیں دیتے۔ ان کا ارشاد ہے کہ:-

میں نہ مسلکِ اہلِ حدیث کو اس کی تمام تفصیلات کے ساتھ صحیح سمجھتا ہوں اور نہ حنفیت یا شافعیت ہی کا پابند ہوں۔ (رسائل و مسائل - حصہ اوّل - صـ ۲۳۵ - ایڈیشن ۱۹۵۱ء)

لیکن ان کے خلاف قریب قریب ہر فرقہ اور ہر مسلک سے وابستگان نے کفر و ضلالت کے فتوے صادر کئے ہیں۔

مفتی محمود کا فتویٰ، مودودی صاحب کے خلاف

ہم سرِ دست ان میں سے، صرف مفتی محمود صاحب کا فتویٰ درج ذیل کرتے ہیں کیونکہ متحدہ محاذ میں یہ دونوں حضرات نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ نومبر ۱۹۶۹ء کا ذکر ہے۔ مفتی صاحب

نے حیدرآباد پریس کلب میں ایک پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ:-

مودودی نے جمعیت العلماء کے مولویوں کے خلاف فتویٰ دیا ہے۔ مودودی کو فتویٰ دینے کا حق حاصل نہیں۔ فتویٰ دینے کا حق مجھے ہے۔ میں اب تک پندرہ ہزار فتوے دے چکا ہوں اور وہ سب مجلد کتابوں میں موجود ہیں۔ میں آج اس پریس کلب میں فتویٰ دیتا ہوں کہ مودودی، گمراہ۔ کافر اور خارج از اسلام ہے۔ اس کے، اور اس کی جماعت سے تعلق رکھنے والے کسی مولوی کے پیچھے نماز پڑھنا، ناجائز اور حرام ہے۔ اس کی جماعت سے تعلق رکھنا کفر اور ضلالت ہے۔ وہ امریکہ اور سرمایہ داروں کا ایجنٹ ہے۔

اب وہ موت کے آخری کنارے پر پہنچ چکا ہے اور اب اسے کوئی طاقت نہیں بچا سکتی۔ اس کا جنازہ نکل کر رہے گا۔ (ہفت روزہ زندگی۔ لاہور۔ مورخہ ۱۰ر نومبر ۱۹۶۹ء)

ہم نے ان فتاویٰ کو دل پر پتھر رکھ کر درج کیا ہے۔ یہ بھی اس مقصد کی خاطر کہ قوم کو معلوم ہو جائے کہ ان حضرات کے باہمی اختلافات کس قدر شدید اور اصولی ہیں۔

یہ ہیں وہ حضرات جو پاکستان میں "نظامِ مصطفیٰ ؐ" قائم کرنے کے لئے متحدہ محاذ بنا رہے ہیں! آپ سوچئے کہ جن لوگوں کے عقائد ایک دوسرے سے اس قدر مختلف ہیں۔ مسلک مختلف ہیں۔ جو ایک دوسرے کو کافر قرار دیتے ہیں، وہ کس قسم کا نظامِ مصطفیٰ ؐ قائم کریں گے؟ حالیہ تحریک کے دوران ان کے اختلاف کی اس قسم کی مثالیں سامنے آئیں کہ:-

۲۵ر اگست کی شام، پاکستان متحدہ محاذ کے بڑے لیڈر جب افطاری کرنے لگے تو اسلامی اخوت اور نظامِ مصطفیٰ ؐ کے قیام کے دعویداروں کے درمیان ایک عجیب منظر دیکھنے میں آیا۔ یہ لیڈر جب افطاری کر چکے تو نماز کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے اور لوگ وہاں یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ مفتی محمود اور نواب زادہ نصراللہ خاں دس بارہ آدمیوں کو لے کر ایک طرف چل پڑے، اور ان نمازیوں کی امامت مفتی صاحب نے کی۔ جبکہ مولانا نورانی اور میاں طفیل محمد دوسری طرف کھڑے ہو گئے۔ یہاں شاہ احمد نورانی نے جماعت کرائی اور تحریکِ استقلال کے میاں محمود علی قصوری نے بھی نورانی صاحب کے پیچھے نماز پڑھی۔ (مساوات۔ ۲۶ر اگست ۱۹۷۷ء)

آپ سوچئے کہ کیا یہ لوگ ملک کو ایک مشترکہ نظام اور مملکت کو پبلک لاز کا ایک ایسا ضابطۂ قوانین دے سکیں گے جسے یہ سب متفقہ طور پر اسلامی تسلیم کریں؟ ہمیں یہ دیکھ کر افسوس (بلکہ صدمہ) ہوتا ہے کہ ملک کا دانشور طبقہ، جو دل میں مملکتِ پاکستان کا درد رکھتا ہے، یہ سمجھ کر الگ ہو بیٹھا ہے کہ یہ مذہبی معاملہ ہے جس سے ہمیں سروکار نہیں۔ ہم ذرا آگے چل کر وضاحت سے عرض کریں گے کہ یہ "مذہبی معاملہ" نہیں۔ اس کا بڑا گہرا تعلق پاکستان کے مستقبل سے ہے اس لئے انہیں اس سے لاتعلق ہو کر نہیں بیٹھ جانا چاہیئے۔ ان حضرات سے پوچھنا چاہیئے کہ جب آپ کے باہمی اختلافات کا یہ عالم ہے تو وہ کونسا نظامِ مصطفیٰ ؐ ہے جسے آپ متحدہ اور

متفقہ طور پر قوم کو دیں گے؟ ان حضرات نے آجتک نہیں بتایا کہ نظامِ مصطفٰےؐ کی اصطلاح کا عملی مفہوم کیا ہے۔ نہ ہی انہوں نے یہ بتایا ہے کہ ملک کے لئے پبلک لاز وضع کرنے کی بنیاد کیا ہوگی؟ یہ ان سوالات کا جواب کبھی نہیں دیں گے کیونکہ اس سے قوم پر ان کے دعاوی کی حقیقت واضح ہو جائے گی۔ مودودی صاحب نے، مئی ۱۹۷۶ء میں جماعتِ اسلامی کے زیرِ اہتمام منعقد ہونے والی وکلا کانفرنس میں فرمایا تھا کہ:-

> میں واضح طور پر کہ دینا چاہتا ہوں کہ اسلامی قانون کا نفاذ اگر ہو سکتا ہے تو صرف اس طرح ہو سکتا ہے ——————— کہ جن لوگوں کے ہاتھ میں اقتدار ہے ان کو اقتدار سے ہٹایا جائے اور ملک کا اقتدار ان لوگوں کے ہاتھ میں منتقل ہو جو اسلام کو جانتے بھی ہیں اور دل سے مانتے بھی ہیں اور اس کے احکام کو نافذ کرنے کا ارادہ بھی رکھتے ہیں۔ ایسے لوگ موجود ہیں اور جس روز ان کے ہاتھ میں اقتدار آئے گا اس کے دوسرے روز اسلامی احکام نافذ ہو جائیں گے۔
>
> (ایشیا۔ ۹ مئی ۱۹۷۶ء)

حیرت ہے کہ پان سو وکلا کے اس مجمع میں سے کسی نے مودودی صاحب سے یہ نہ پوچھا کہ:-

(۱) آپ خود کہہ چکے ہیں کتاب و سنت کی بنا پر کوئی ایسا ضابطۂ قوانین مرتب نہیں ہو سکتا جو تمام فرقوں کے نزدیک اسلامی قرار پا سکے۔

(۲) آپ نے فقہِ حنفی کے رائج کرنے کی تجویز پیش کی اور غیر حنفی فرقوں کی طرف سے اس کی اس قدر مخالفت ہوئی۔

(۳) مختلف فرقوں کے باہمی اختلافات اس قدر شدید ہیں کہ سب ایک دوسرے کو بھی کافر کہتے ہیں، اور آپ کو بھی۔

تو ان حالات میں وہ کونسا ضابطۂ احکام ہے جسے آپ اقتدار حاصل ہونے کے دوسرے دن ہی نافذ کر دیں گے اور تمام فرقے اسے اسلامی تسلیم کر لیں گے؟

کسی ایک نے بھی ان سے یہ سوال نہ پوچھا۔ اور نہ ہی اب کوئی شخص نظامِ مصطفٰےؐ کے مدعیوں سے یہ پوچھتا ہے کہ اس اصطلاح کا عملی مفہوم کیا ہے؟ کیا یہ "کتاب و سنت" سے الگ کوئی چیز ہے کیونکہ کتاب و سنت کی رو سے تو (خود آپ حضرات کے قول کے مطابق) کوئی متفقہ علیہ نظام یا ضابطہ مرتب نہیں ہو سکتا؛ کوئی ان سے یہ نہیں پوچھتا اور ملک میں انتشار بڑھتا جا رہا ہے۔

مایوسی کی کوئی بات نہیں

اس مقام پر یقیناً آپ کے دل میں یہ سوال پیدا ہوگا کہ جب حالات ایسے مایوس کن ہیں، تو پھر پاکستان ایک اسلامی مملکت کیسے بن سکے گا؟ اس میں ایسا ضابطۂ قوانین کیسے مرتب ہو سکے گا جو تمام فرقوں کے نزدیک متفقہ طور پر اسلامی ہو! علامہ اقبالؒ نے جب اسلامی مملکت کا تصور دیا تھا تو ان کے سامنے یہ سوال بھی تھا، اور اس کا انہوں نے بڑی تفصیل سے جواب دیا تھا۔ ذیل میں ہم اس کا ملخص پیش کرتے ہیں۔

انہوں نے کہا کہ مسلمانوں میں بے شک متعدد فرقے ہیں اور ان کی الگ الگ فقہیں بھی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود، ان میں ایک ایسی قدر مشترک ہے جس پر سب کا ایمان ہے۔ اور وہ ہے ——— قرآن مجید ——— اسلامی مملکت کی اساس اسی کتابِ خداوندی پر استوار ہوتی ہے۔

قرآن مجید کی صورت یہ ہے کہ اس میں (بجز چند مستثنیات) اصول اور حدود دیئے گئے ہیں۔ ان کے جزئی احکام نہیں دیئے گئے۔ مقصد اس سے یہ ہے کہ ہر زمانے کی اسلامی مملکت، ان حدود کے اندر رہتے ہوئے، قرآنی اصولوں کی روشنی میں، اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق جزئی قوانین خود مرتب کرے۔ قرآن حکیم کے اصول و حدود تو ہمیشہ کے لئے غیر متبدل رہیں گے۔ لیکن ان کی روشنی میں مرتب کردہ قوانین میں، زمانے کے بدلتے ہوئے حالات کے مطابق تبدیلی کی جا سکے گی۔ علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں:-

> اسلام کا پیش کردہ تصور یہ ہے کہ حیاتِ کلی کی روحانی اساس ازلی اور ابدی ہے لیکن اس کی نمود تغیر و تنوع کے پیکروں میں ہوتی ہے جو۔۔۔ معاشرہ حقیقتِ مطلقہ کے متعلق اس قسم کے تصور پر متشکل ہو اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنی زندگی میں مستقل اور تغیر پذیر عناصر میں توافق پیدا کرے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ اس کے پاس اپنی اجتماعی زندگی کے نظم و ضبط کے لئے مستقل اور ابدی اصول ہوں۔۔۔۔ لیکن اگر ابدی اصولوں کے متعلق یہ سمجھ لیا جائے کہ ان کے دائرے میں تغیر کا امکان ہی نہیں تو اس سے زندگی، یکسر جامد اور متصلب بن کر رہ جائے گی۔
>
> یورپ کو عمرانی اور سیاسی امور میں جو ناکامی ہوئی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے ہاں کوئی ابدی اور غیر متبدل اصولِ حیات نہیں تھے۔ اس کے برعکس، گزشتہ پانچ سو سال میں اسلام جس قدر جامد اور غیر متحرک بن کر رہ گیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے مستقل اقدار کے دائرے میں اصولِ تغیر کو نظر انداز کر رکھا ہے۔۔۔۔۔ دورِ حاضر کے مسلمان کو چاہیئے کہ وہ اپنی پوزیشن کو اچھی طرح سمجھے۔ (قرآن کے) غیر متبدل اصولوں کی روشنی میں اپنے معاشرہ کی تشکیلِ جدید کرے اور وہ عالمگیر جمہوریت قائم کر کے دکھا دے جو اسلام کی اصل و غایت تھی جو ابھی تک پورے طور پر بے نقاب ہو کر دنیا کے سامنے نہیں آئی۔ (خطبات تشکیلِ جدید)

انہوں نے مختلف فرقوں کے ان ائمہ فقہ کی کوششوں کو سراہا جنہوں نے زندگی کے مختلف شعبوں کے لئے جزئی احکام وضع کئے تھے، لیکن اس کے بعد کہا کہ:-

> اس تمام ہمہ گیری کے باوجود، یہ قانونی ضوابط بالآخر انفرادی تعبیرات کا مجموعہ ہیں۔ اس لئے انہیں حتمی اور قطعی سمجھ لینا غلط ہے۔ (یہ اپنے اپنے زمانے میں مناسب اور موزوں ہو سکتے تھے) لیکن اب حالات بدل چکے ہیں اور دنیائے اسلام ان نئی نئی قوتوں سے دوچار اور متاثر ہے جو زندگی کے مختلف گوشوں میں فکرِ انسانی کی نشو و ارتقاء سے وجود میں آ گئی ہیں۔ اس لئے مجھے کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ اس قدامت پرستانہ ذہنیت کو باقی رکھا جائے۔۔۔۔۔ اس لئے اگر دورِ حاضرہ کے اعتدال پسند مسلمان (زمانے کے بدلتے ہوئے حالات اور اپنے تجربہ کی روشنی میں

> فقہ کے اصولِ اساسی کی نئی تعبیرات کرنا چاہتے ہیں تو ان کا یہ طرزِ عمل میرے خیال میں بالکل بجا اور درست ہے۔ خود قرآن کی یہ تعلیم کہ حیات ایک ترقی پذیر عمل ارتقاء ہے اس کی مقتضی ہے کہ ہر نئی نسل کو اس کا حق ہونا چاہیئے کہ وہ اپنی مشکلات کا حل خود تلاش کرے۔ وہ ایسا کرنے میں اسلاف کے علمی سرمایہ سے راہ نمائی لے سکتی ہے لیکن اسلاف کے فیصلے ان کی راہ میں روک نہیں بن سکتے۔ (خطبات)

یہ تھا وہ اصول جس کے مطابق، مملکتِ پاکستان میں ایسا آئین اور ضابطہ قوانین مرتب کیا جانا مقصود تھا جو صحیح معنوں میں اسلامی کہلا سکے اور زمانے کے تقاضوں کو بھی پورا کر سکے۔ اس قسم کے آئین اور ضابطہ کی تدوین کے لئے مذہبی پیشوائیت (P R I E S T S) کی ضرورت نہیں تھی۔ ضرورت صرف اتنی تھی کہ مجلس آئین و قوانین ساز ایسے اربابِ فکر و نظر پر مشتمل ہو جن کی نگاہ قرآنِ مجید کے اصول و حدود پر ہو، اور جو عصرِ حاضر کے تقاضوں سے باخبر ہوں۔ عہدِ رسالتمآبؐ اور خلافتِ راشدہ میں اسلامی نظام کا ایسا ہی نقشہ تھا۔ اس دور میں اسلامی معاشرہ میں مذہبی پیشوائیت کا وجود تک نہیں تھا۔

علامہ اقبالؒ کے پیش کردہ نظریہ کو قائدِاعظمؒ نے جامع حیثیت سے چند الفاظ میں سمیٹ کر رکھ دیا جب (حیدرآباد۔ دکن کے طلبا کے سوال کے جواب میں) کہا کہ:-

> اسلامی حکومت کے تصور کا یہ امتیاز ہمیشہ پیشِ نظر رہنا چاہیئے کہ اس میں اطاعت اور وفاکیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے جس کی تعمیل کا واحد ذریعہ قرآنِ مجید کے احکام اور اصول ہیں۔۔۔۔۔ اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ کسی پارلیمان کی۔ نہ کسی اور شخص یا ادارہ کی۔ قرآنِ مجید کے اصول ہی سیاست یا معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔ اسلامی حکومت دوسرے الفاظ میں قرآنی اصول اور احکام کی حکمرانی ہے۔ اور حکمرانی کے لئے آپ کو علاقہ اور مملکت کی ضرورت ہے۔

یہ تھا بانیانِ پاکستان (علامہ اقبالؒ اور قائدِاعظمؒ) کے نزدیک اس مملکت میں نظامِ خداوندی قائم کرنے کا طریق۔ لیکن ہماری بدقسمتی ہے کہ تشکیلِ پاکستان کے بعد، نہ ہم میں علامہ اقبالؒ رہے، نہ قائدِاعظمؒ، اور اسلام کی نمائندگی مذہبی پیشوائیت کے ہاتھ میں آگئی ——— ان کے ہاتھ میں جو سرے سے قیامِ پاکستان ہی کے خلاف تھے اور تقسیمِ ہند کو غیر اسلامی قرار دیتے تھے۔

مودودی صاحب اور تدوینِ قوانین

آپ یہ معلوم کرکے حیران ہوں گے کہ خود مودودی صاحب کے نزدیک بھی قوانین سازی کا صحیح مسلک اور طریقِ کار وہی ہے جسے علامہ اقبالؒ نے پیش کیا تھا۔ وہ قرآنِ کریم کے متعلق لکھتے ہیں کہ:-

> دین کے اصول سب کے سب کتاب اللہ میں موجود ہیں جو روایات سے بالاتر اور سب مسلمانوں میں مشترک ہیں۔
> (تفہیمات۔ حصہ اوّل۔ ص ۳۳۹)

دوسری جگہ لکھتے ہیں:-

یہ اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ جن چیزوں پہ کفر و اسلام کا مدار ہے اور جن امور پر انسان کی نجات موقوف ہے انہیں بیان کرنے کا اللہ تعالیٰ نے خود ذمہ لیا ہے اور وہ سب قرآن میں بیان کی گئی ہیں۔ اور قرآن میں بھی ان کو کچھ اشارۃً کنایۃً بیان نہیں کیا گیا بلکہ پوری صراحت اور وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ (رسائل و مسائل - حصہ اوّل - صلا)

پھر ارشاد ہے :۔
قرآنِ کریم اپنے مدعا کو بغیر کسی ابہام کے صاف صاف بیان کرتا ہے اور اس نے کسی ایسی حقیقت کو جس کا جاننا آدمی کے لیئے ضروری تھا واضح کئے بغیر نہیں چھوڑا۔
(ترجمان القرآن - بابت اپریل - مئی ۱۹۵۲ء)

اب رہا یہ اہم سوال کہ قرآنِ مجید کے اصولوں کی روشنی میں جو جزئی قوانین عہدِ رسالت مآبؐ اور عہدِ صحابہؓ میں مرتب ہوئے تھے، کیا وہ قیامت تک غیر متبدل رہیں گے یا ان میں زمانے کے تغیرِ احوال کے مطابق ردو بدل کیا جا سکتا ہے۔ غور سے سنیئے کہ اس باب میں مودودی صاحب کا کیا ارشاد ہے۔ فرماتے ہیں :۔

مودودی صاحب اور جزئیاتِ دین

یہ حقیقت ناقابلِ انکار ہے کہ شارع نے غایت درجہ کی حکمت اور کمالی درجہ کے علم سے کام لے کر اپنے احکام کی بجاآوری کے لیئے زیادہ تر ایسی ہی صورتیں تجویز کی ہیں جو تمام زمانوں اور تمام مقامات اور تمام حالات میں اس کے مقاصد کو پورا کرتی ہیں لیکن اس کے باوجود بکثرت جزئیات ایسی بھی ہیں جن میں تغیر حالات کے لحاظ سے احکام میں تغیر ہونا ضروری ہے۔ جو حالات عہدِ رسالتؐ اور عہدِ صحابہؓ میں عرب اور دنیائے اسلام کے تھے، لازم نہیں کہ بعینہٖ وہی حالات ہر زمانہ اور ہر ملک کے ہوں۔ لہٰذا احکامِ اسلامی پر عمل کرنے کی جو صورتیں ان حالات میں اختیار کی گئی تھیں۔ ان کو ہو بہو تمام زمانوں اور تمام حالات میں قائم رکھنا اور مصالح اور حکم کے لحاظ سے ان کی جزئیات میں کسی قسم کا ردو بدل نہ کرنا ایک طرح کی رسم پرستی ہے۔ جس کو روحِ اسلامی سے کوئی علاقہ نہیں .... پس معلوم ہوا کہ جزئیات میں دلالۃ النص اور اشارۃ النص تو درکنار صراحۃ النص کی پیروی بھی تفقہ کے بغیر درست نہیں ہوتی اور تفقہ کا اقتضاء یہ ہے کہ انسان ہر مسئلہ میں شارع کے مقاصد و مصالح پر نظر رکھے اور انہی کے لحاظ سے جزئیات میں تغیرِ احوال کے ساتھ ایسا تغیر کرتا رہے جو شارع کے اصولِ تشریع پر مبنی اور اس کے طرزِ عمل سے اقرب ہو۔ (تفہیمات - حصہ دوم - صلاکا)

اس کی تفصیل میں دوسرے مقام پہ لکھتے ہیں :۔
مدینہ طیبہ سے مماثلت کرنے کا مفہوم کہیں یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ ہم ظاہر اشکال میں مماثلت پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ اور دنیا اس وقت تمدن کے جس مرتبہ پر ہے اس سے رجعت کر کے اس تمدنی مرتبہ پر واپس جانے کے خواہش مند ہیں جو عرب میں ساڑھے تیرہ سو برس پہلے تھا۔ اتباعِ رسولؐ کا یہ مفہوم ہی سرے سے غلط ہے اور اکثر دیندار لوگ غلطی سے اس کا یہی مفہوم لیتے ہیں۔ ان کے نزدیک سلفِ صالح کی پیروی اس کا نام

ہے کہ ــــــ تمدن وحضارت کی جو حالت ان کے عہد میں تھی اس کو ہم بالکل متحجر (FOSSILISED) صورت میں قیامت تک باقی رکھنے کی کوشش کریں اور ہمارے اس ماحول سے باہر کی دنیا میں جو تغیرات واقع ہو رہے ہیں ان سب سے آنکھیں بند کر کے ہم اپنے دماغ اور اپنی زندگی کے اردگرد ایک حصار کھینچ لیں جس کی سرحد میں وقت کی حرکت اور زمانے کے تغیر کو داخل ہونے کی اجازت نہ ہو۔ اتباع کا یہ تصور جو دورِ انحطاط کی کئی صدیوں سے دیندار مسلمانوں کے دماغوں پر مسلّط ہے۔ درحقیقت روحِ اسلام کے بالکل منافی ہے۔ اسلام کی یہ تعلیم ہرگز نہیں ہے کہ ہم جیتے جاگتے آثارِ قدیمہ بن کر رہیں۔ اور اپنی زندگی کو قدیم تمدن کا ایک تاریخی ڈرامہ بنائے رکھیں۔ وہ ہمیں رہبانیت اور قدامت پرستی نہیں سکھاتا۔ اس کا مقصد دنیا میں ایک ایسی قوم پیدا کرنا نہیں جو تغیر و ارتقا کو روکنے کی کوشش کرتی رہے۔ بلکہ اس کے برعکس وہ ایک ایسی قوم بنانا چاہتا ہے جو تغیر و ارتقاء کو غلط راستوں سے روک کر صحیح راستوں پر چلانے کی کوشش کرے۔ وہ ہم کو قالب نہیں دیتا بلکہ روح دیتا ہے اور چاہتا ہے کہ زمان و مکان کے تغیرات سے زندگی کے جتنے بھی مختلف قالب قیامت تک پیدا ہوں، ان سب میں یہی روح بھرتے چلے جائیں۔ مسلمان ہونے کی حیثیت سے دنیا میں ہمارا اصلی مشن یہی ہے کہ ہم کو "خیر امۃ" جو بنایا گیا ہے تو اس لئے نہیں کہ ہم ارتقاء کے راستے میں آگے بڑھنے والوں کے پیچھے عقب لشکر (REAR GUARD) کی حیثیت میں لگے رہیں۔ بلکہ ہمارا کام امامت و رہنمائی ہے۔ ہم مقدمۃ الجیش بننے کے لئے پیدا کئے گئے ہیں اور ہمارے "خیر اُمۃ" ہونے کا راز "اخرجت للناس" میں پوشیدہ ہے۔ رسول اللہ اور آپؐ کے اصحابؓ کا اصلی اسوہ جس کی پیروی ہمیں کرنی چاہیئے یہ ہے کہ انہوں نے قوانینِ طبعی کو قوانین شرعی کے تحت کر کے زمین میں خدا کی خلافت کا پورا پورا حق ادا کر دیا۔ ان کے عہد میں جو تمدن تھا انہوں نے اس کے قالب میں روح پھونکی ــــ پس نبیؐ اور اصحابِؓ نبی کا صحیح اتباع یہ ہے کہ تمدن کے ارتقاء اور قوانینِ طبعی کے اکتشافات سے اب جو وسائل پیدا ہوئے ہیں ان کو ہم اسی طرح تہذیبِ اسلامی کا خادم بنانے کی کوشش کریں جس طرح صدرِ اوّل میں کی گئی تھی۔ نجاست اور گندگی جو کچھ ہے وہ ان وسائل میں نہیں ہے۔ بلکہ اس کافرانہ تہذیب میں ہے جو ان وسائل سے فروغ پا رہی ہے۔

(نشانِ راہ ۔ ص۵۵ [1])

دوسرے مقام پر وہ لکھتے ہیں کہ "عبادات" کے علاوہ دیگر احکام کی جزئیات ہم خود متعین کر سکتے ہیں۔ اب رہ گئے احکام، تو قرآنِ مجید میں ان کے متعلق زیادہ تر کلی قوانین بیان کئے گئے ہیں اور بیشتر امور میں تفصیلات کو چھوڑ دیا گیا ہے۔ نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے عملاً ان احکام کو زندگی کے معاملات میں جاری فرمایا اور اپنے عمل اور قول سے ان کی تفصیلات ظاہر فرمائیں۔ ان تفصیلات میں بعض

---

[1] اس وقت اصل کتاب ہمارے سامنے نہیں اس لئے ہو سکتا ہے کہ حوالہ میں کچھ فرق رہ گیا ہو۔

ایسی ہیں جن میں ہمارے اجتہاد کو کوئی دخل نہیں۔ ہم پر لازم ہے کہ جیسا عملِ حضورؐ سے ثابت ہے اسی کی پیروی کریں۔ مثلاً عبادات کے[1] احکام اور بعض تفصیلات ایسی ہیں کہ ان سے ہم اصول اخذ کر کے اپنے اجتہاد سے فروع مستنبط کر سکتے ہیں۔ مثلاً عہدِ نبویؐ کے قوانین مدنی، اور بعض تفصیلات ایسی ہیں کہ ان سے ہم کو اسلام کی سپرٹ معلوم ہوتی ہے۔ اگر یہ اسپرٹ ہمارے قلب و روح میں جاری و ساری ہو جائے تو ہم اس قابل ہو جائیں گے کہ زندگی کے جملہ معاملات اور مسائل پر ایک مسلمان کی سی ذہنیت اور ایک مسلمان کی سی بصیرت کے ساتھ غور کریں۔ دنیا کے علمی اور عملی مسائل کو اسلامی نقطۂ نظر سے دیکھیں اور ان کے متعلق وہی رائے قائم کریں جیسی ایک مسلمان کو کرنی چاہیئے۔ (تفہیمات۔ حصہ اوّل۔ صـ۳۳۲)

اصل سوال مملکت کے لئے قوانینِ مدنی (پبلک لاز) کا ہے۔ ان کے متعلق مودودی صاحب کا ارشاد ہے کہ جو قوانین، صدرِ اوّل میں مرتب ہوئے تھے، ان میں تغیرِ حالات کے ماتحت، ردّ و بدل کیا جا سکتا ہے۔ علاوہ ازیں:-

اب اگر کوئی ایسا حادثہ پیش آتا ہے جو صحابہ یا ائمہ کے دور میں پیش نہیں آیا، یا کوئی ایسی چیز ایجاد ہوتی ہے جو اُس دور میں موجود ہی نہ تھی تو اس کے متعلق متقدمین کے اجتہادی احکام میں کوئی حکم تلاش کرنا بداہتہً غلط ہے۔ ایسے ہر حادثے اور ہر چیز کے لئے ہم کو بھی اسی طرح اصول و کلیات کی طرف رجوع کرنا پڑے گا جس طرح صحابہ اور ائمہ نے اپنے عہد کے حوادث میں کیا تھا۔ (تفہیمات۔ حصہ دوم۔ صـ۳۸۷)

مولانا امین احسن اصلاحی نے (جو اُس زمانے میں مودودی صاحب کے دستِ راست تھے) لکھا تھا:-

قرآن و حدیث کے اندر بیشتر صرف بنیادی اور اصولی باتیں ہی بیان کی گئی ہیں۔ جزئیات و تفصیلات سے ان میں بہت کم تعرض کیا گیا ہے۔ اس خلاء کو حالات و ضروریات کے تحت بھرنا، نیز تمام پیش آنے والے اجتماعی اور سیاسی معاملات میں اسلام کے منشاء اور مزاج کے مطابق قوانین بنانا اُمت کی صوابدید پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ (ترجمان القرآن۔ اپریل ۱۹۵۴ء)

ظاہر ہے کہ اس قسم کا تغیر و تبدل یا حک و اضافہ، اسلامی مملکت کے اختیار میں ہوگا۔ کوئی فرد یا گروہ، اپنے طور اس کا مجاز نہیں ہوگا۔

یہی مسلک علامہ اقبالؒ کا تھا اور اسی کو طلوعِ اسلام گذشتہ تیس سال سے پیش کرتا چلا آ رہا ہے۔ اور یہی ہے اس کا وہ جرم جس کی بنا پر اسے کافر و ملحد، اور نہ معلوم کیا کیا کہا جا رہا ہے!

تصریحاتِ بالا سے واضح ہے کہ جس مسلک کو خود مودودی صاحب، تقاضائے اسلام کے عین مطابق قرار

---

[1] قارئین اسے خاص طور پر نوٹ کر لیں کہ صرف بعض تفاصیل۔ مثلاً عبادات کے احکام میں حضورؐ کی پیروی ضروری ہے۔ باقی امور میں نہیں۔ (طلوعِ اسلام)

دیتے ہیں اس کی رو سے، پاکستان میں پبلک لاز کا مرتب کیا جانا کچھ بھی مشکل نہیں رہتا۔ مودودی صاحب تو ایک طرف، مفتی صاحب سے متعلق بھی اگلے دنوں اخبارات میں یہ رپورٹ شائع ہوئی تھی :-

> پاکستان قومی اتحاد نے اعلان کیا ہے کہ ملک میں قرآن مجید کا نظام نافذ کرنے کی جدوجہد اب فیصلہ کن مرحلے میں داخل ہو گئی ہے۔ آج یہاں نشتر پارک میں ایک عظیم الشان اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے قومی اتحاد کے سربراہ مولانا مفتی محمود نے قرآنِ پاک کا ایک نسخہ ہاتھوں میں تھام کر کہا کہ کراچی کے باعیت شہریوں نے مجھے یہ نسخہ پیش کیا ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ یہی کتابِ مقدس ہمارا منشور ہے۔ دنیا میں اس سے بڑھ کر کوئی منشور پیش نہیں کیا جا سکتا۔ میں یہی عظیم منشور آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ اور وعدہ کرتا ہوں کہ برسرِ اقتدار آنے کے بعد ہم اسی پر عمل کریں گے۔
>
> (نوائے وقت۔ بابت ۲۴ ستمبر ۱۹۷۷ء)

اس کے بعد یہ فیصلہ کن سوال سامنے آتا ہے کہ :-

(۱) ایک طرف قرآن مجید کو بنیاد قرار دینے کا وہ اصول ہے جس کے مطابق اسلامی مملکت کے لئے ضوابط آئین و قوانین بلا دِقت مرتب کئے جا سکتے ہیں۔ اور

(۲) دوسری طرف وہ طریق ہے (جس کی تفصیل پہلے گذر چکی ہے اور) جس کے مطابق ایسا ضابطۂ قوانین مرتب ہونا ناممکنات میں سے ہے۔

تو یہ حضرات، پہلے طریق کو چھوڑ کر، دوسرے طریق پر کیوں اصرار کر رہے ہیں؟ اس سوال کا جواب بڑے ہی غور و فکر کا متقاضی ہے، اور نہایت ٹھنڈے دل سے سوچ بچار کے قابل۔ ہماری درخواست یہ ہے کہ آپ، جانبداری اور تعصب کے ہر قسم کے جذبات سے الگ ہو کر، اس پر غور کریں۔ بات آپ کی سمجھ میں آ جائے گی۔

"نظامِ مصطفےٰ" کی اصطلاح اگرچہ بریلوی فرقہ کے نمائندہ مولانا شاہ احمد نورانی صاحب کی پیش کردہ ہے۔ (اور بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ اس کی علّتِ غائی کیا ہے) لیکن اسلامی قوانین کے سلسلہ میں مؤثر آواز مفتی محمود اور مودودی صاحب ہی کی ہے۔ مفتی صاحب کا تعلق جمعیت العلماء ہند سے تھا جس کے صدر مولانا حسین احمد مدنی (مرحوم) تھے۔ موجودہ دیوبندی علماء کا مولانا مدنی (مرحوم) سے تعلق استاذ۔ شاگردی ہی کا نہیں، بلکہ مرشد طریقت اور مریدوں کا بھی ہے۔ یہ تعلق ایسا ہے جو کبھی منقطع نہیں ہوتا۔ مولانا مدنی (مرحوم) نے، مطالبۂ پاکستان کی مخالفت سیاسی وجوہات کی بنا پر نہیں کی تھی۔ مذہب کی بنا پر کی تھی۔ وہ اس تحریک کو خلافِ اسلام قرار دیتے تھے اور اس میں شرکت، حرام۔ مفتی محمود صاحب ان کے اس مسلک کے سرگرم مبلغ تھے۔ وہ آج بھی مولانا مدنی (مرحوم) کے اس عقیدہ اور مسلک کو باطل نہیں سمجھتے ـــ وہ ایسا سمجھ سکتے ہی نہیں۔ آپ ان سے پوچھ کر دیکھ لیجئے۔ وہ کبھی یہ نہیں کہیں گے کہ مولانا مدنی (مرحوم) غلطی پر تھے۔ وہ اب بھی یہی کہتے ہیں کہ ہم نظریۂ پاکستان کے مخالف تھے اور مسلمانوں کے لئے صوبجاتی آزادی ہی کو صحیح سمجھتے تھے۔ ان حالات میں آپ خود ہی فیصلہ فرمائیے کہ کیا مفتی صاحب اسے کبھی دل سے پسند فرما سکتے ہیں کہ پاکستان ایک کامیاب اسلامی مملکت بن جائے اور اس طرح یہ ثابت ہو جائے کہ ان کے اور ان کے پیر و مرشد کا مسلک غلط تھا! اس مقصد میں کامیابی کا آسان طریق یہ ہے کہ ایسی صورت پیدا کی جائے کہ یہاں کوئی متفق علیہ ضابطہ قوانین مرتب ہی نہ ہو سکے۔ مفتی صاحب کا دیوبند سے تعلق کس قدر گہرا ہے اس کا اندازہ اس سے لگا لیجئے کہ وہ حال ہی میں لندن تشریف

لے گئے ہیں تو مولانا حسین احمد مدنی (مرحوم) کے صاحبزادہ مولانا اسعد قاہرہ سے ان کے ہم سفر تھے۔ (نوائے وقت ۱۶ نومبر ۱۹۷۸ء)

مودودی صاحب کا مسئلہ ان کی ذاتی افتادِ طبع کا ہے۔ ان کے برادرِ بزرگ، مولانا ابوالخیر مودودی صاحب نے ان کے متعلق، نیاز فتحپوری (مرحوم) کے نام اپنے خط میں لکھا تھا کہ:-

> باقی رہے ابوالاعلیٰ۔ سو وہ "بعد از خدا بزرگ" ہو چکے ہیں۔

اس کا نتیجہ ہے کہ مودودی صاحب نے آج تک کبھی یہ نہیں کیا کہ انہوں نے فلاں معاملہ میں جو کچھ کہا تھا وہ غلط تھا۔ یا یہ کہ واقعات نے اسے غلط ثابت کر دیا ہے۔ انہوں نے مسلمانوں کے لئے جداگانہ مملکت کی مسلسل مخالفت کی۔ انہوں نے کہا تھا کہ:-

> جو لوگ یہ گمان کرتے ہیں اگر مسلم اکثریت کے علاقے ہندو اکثریت کے تسلط سے آزاد ہو جائیں اور یہاں جمہوری نظام قائم ہو جائے تو اس طرح حکومتِ الٰہی قائم ہو جائے گی۔ ان کا گمان غلط ہے۔ دراصل اس کے نتیجے میں جو کچھ حاصل ہوگا وہ مسلمانوں کی کافرانہ حکومت ہوگی۔
>
> (ترجمان القرآن - بابت محرم - ۱۳۶۰ھ)

بلکہ یہاں تک کہہ:-

> بعض لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ ایک دفعہ غیر اسلامی ہی سہی، مسلمانوں کا قومی اسٹیٹ تو قائم ہو جائے پھر رفتہ رفتہ تعلیم و تربیت اور اخلاقی اصلاح کے ذریعے اس کو اسلامی اسٹیٹ میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ مگر میں نے تاریخ، سیاست اور اجتماعیت کا جو تھوڑا بہت مطالعہ کیا ہے اس کی بنا پر میں اس کو ناممکن العمل سمجھتا ہوں۔ اور اگر یہ منصوبہ کامیاب ہو جائے تو میں اس کو ایک معجزہ سمجھوں گا۔ (ایضاً)

ہم یہ بھی دیکھ چکے ہیں کہ انہوں نے کہا تھا کہ متحدہ ہندوستان پورے کا پورا پاکستان بن سکتا ہے اور وہاں حکومتِ خداوندی بآسانی قائم ہو سکتی ہے۔

——— ان حقائق کی روشنی میں آپ خود ہی فیصلہ فرمائیے کہ مودودی صاحب کسی صورت میں بھی اسے برداشت یا گوارا کر سکتے ہیں کہ جو کچھ انہوں نے اس حتم و یقین اور اس شدت و صلابت کے ساتھ کہا تھا' وہ غلط ثابت ہو جائے۔ ان کی انتہائی کوشش ہوگی کہ واقعات ثابت کر دیں کہ جو کچھ انہوں نے کہا تھا' وہ صحیح تھا۔ پاکستان اسلامی مملکت بن ہی نہیں سکتا۔

اس کے ساتھ اس حقیقت کو بھی سامنے رکھئے کہ دنیا کی کوئی قوت بھی یہ نہیں چاہتی کہ کرۂ ارض کے کسی خطہ میں بھی قرآنی نظام قائم ہو جائے۔ اس لئے کہ اس نظام کے درخشندہ، انسانیت ساز نتائج' ان کے ہر نظام کے لئے پیامِ موت ہوں گے ——— خواہ وہ مغرب اور امریکہ کی جمہوریت ہو اور خواہ روس اور چین کی کمیونزم یا سوشلزم۔

اگر پاکستان اسلامی مملکت نہ بن سکا تو اس کا نتیجہ کیا ہوگا' اسے بھی غور سے سمجھنے کی ضرورت ہے۔ یہاں ایک ایسا طبقہ موجود ہے جو کہتا ہے کہ مسلمانوں کے لئے ایک الگ مملکت کی ضرورت ہی کیا تھی! متحدہ ہندوستان

اگر اسلامی مملکت قائم نہ ہوئی تو......

میں ہم اس سے بھی اچھے رہتے ——— اس کے جواب میں، بنیادی طور پر کہا جاتا ہے کہ ہم اپنے لئے اسلامی مملکت چاہتے تھے اور غیر منقسم ہندوستان میں اس کے قیام کا امکان نہیں تھا۔

اب آپ سوچئے کہ اگر مختلف فرقوں کے نمائندے (جو اس وقت نظامِ مصطفےٰ کے داعی ہیں) پارلیمان میں پہنچے اور مملکت کے لئے پبلک لاز مرتب کرنے کا مرحلہ سامنے آیا تو ان میں کس قدر باہمی سرپھٹول ہوگی۔ (جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے) ایسا ضابطۂ قوانین مرتب ہو ہی نہیں سکے گا۔ اس وقت وہ طبقہ (جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے) کہے گا کہ اب فرمائیے! ایک الگ مملکت کی آپ کے پاس وجہ جواز کیا ہے؟ اتنا ہی نہیں۔ وہ ہمیں کچھ اور بھی یاد دلائے گا۔

ہندوؤں کی طرف سے ردِ عمل

مطالبۂ پاکستان کے سلسلہ میں کانگرس کے لیڈر بار بار کہتے تھے کہ اس زمانہ میں اس قسم کی اسکیم کبھی کامیاب نہیں ہو سکے گی۔ پارلیمان میں کانگریس پارٹی کے سربراہ مسٹر بھولا بھائی ڈیسائی نے کہا تھا:۔

> اب یہ ناممکن ہے کہ کوئی ایسا نظامِ حکومت قائم کیا جا سکے جس کی بنیاد مذہب پر ہو۔ اب وقت آ چکا ہے کہ ہم اعتراف کریں اور اسے اچھی طرح ذہن نشین کریں کہ ضمیر، مذہب اور خدا کو ان کے مناسب مقام، یعنی آسمان کی بلندیوں پر رکھ دیا جائے اور انہیں خواہ مخواہ زمین کے معاملات میں گھسیٹ کر نہ لایا جائے۔ اس بات کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ اگر مذہب کو سیاست سے الگ نہ کیا جائے تو کوئی نظامِ حکومت قائم رہ سکتا ہے۔ عصرِ حاضر میں بہترین نظامِ حکومت اس نظریہ پر قائم ہو سکتا ہے کہ جغرافیائی حدود کے .... اندر گھرا ہوا ایک ملک ہو اور اس ملک کے اندر رہنے والے تمام افراد معاشی اور سیاسی مفاد کے رشتے میں منسلک ہو کر ایک قوم بن جائیں۔
>
> (ہندوستان ٹائمز۔ ۵ ۹/۴۸)

خود (مہاتما) گاندھی بار بار کہتے تھے کہ:۔

> اگر میں ڈکٹیٹر ہوتا تو مذہب اور حکومت کو بالکل الگ الگ کر دیتا۔ مجھے میرے مذہب کی قسم میں اس کے لئے جان تک دے دیتا۔ مذہب میرا ذاتی معاملہ ہے۔ حکومت کو اس سے کیا واسطہ۔
>
> (ہریجن۔ ۹ ۱۲/۴۶)

جب ۱۹۴۰ء میں قراردادِ پاکستان پاس ہوئی تو (مہاتما) گاندھی پکار پکار کر کہہ رہے تھے کہ مسلمانو! .... تم جناحؒ کے فریب میں مت آؤ۔ یہ اسکیم کبھی کامیاب نہیں ہو سکے گی۔ مذہب کی بنیاد پر کوئی مملکت قائم نہیں ہو سکتی۔

جب مذہب کی بنیاد پر مملکتِ پاکستان کا نظام قائم نہیں ہو سکے گا تو یہاں ایک مہم چل نکلے گی جو کہے گی کہ اس کے بعد اس علیحدہ مملکت کی ضرورت کیا رہ جاتی ہے؟ ادھر خود ہندوستان سے بھی یہ آواز ابھرے گی کہ جو کچھ ہوا سو ہوا۔ آیئے! اب روٹھے ہوئے بھائی پھر سے گلے مل جائیں۔ اس "ملاپ"

سکے لئے ان کے راہ نماؤں نے پہلے ہی سے گنجائش رکھ لی تھی۔ اس زمانے کے مہاتما گاندھی اور دیگر کانگرسی لیڈروں کے بیانات (جو طلوعِ اسلام میں متعدد بار شائع ہو چکے ہیں) اس پر شاہد ہیں۔

یہ ہیں وہ حقائق جنہیں ہم نے بلا کم و کاست پیش کر دیا ہے —— پاکستان نہ طلوعِ اسلام کی ذاتی ملکیت ہے، نہ میراث، جو اس کے تحفظ اور استحکام کا فریضہ اس کی واحد اجارہ داری سمجھی جائے۔ یہ ساری قوم کا مامن و مسکن ہے۔ (قطعِ نظر اسلام کے) اس میں ہم سب نے، اور ہماری نسلوں نے رہنا ہے۔ ہماری ماؤں، بہنوں، بیٹیوں کی عصمت و ناموس کا تحفظ اس کے ساتھ وابستہ ہے۔ اگر ملک میں کوئی ایسا طبقہ موجود ہے —— اور ہمیں یقین ہے کہ وہ موجود ہے —— جو ان احساسات میں ہمارا شریک ہے تو ہم ان سے درخواست کریں گے کہ جو کچھ ہم نے پیش کیا ہے اس پر ٹھنڈے دل سے غور کریں۔ وہ سوچیں کہ جو کچھ یہاں اسلام کے نام سے کیا جا رہا ہے اس کا مآل اور انجام کیا ہوگا؟ اور اگر وہ اس باب میں بھی ہم سے متفق ہوں تو پھر سر جوڑ کر بیٹھیں اور سوچیں کہ مملکت کو اس خطرہ سے محفوظ رکھنے کی کیا تدبیر کی جائے۔ یہ حقیقت ہے کہ ——

(۱) اس مملکت کا جداگانہ وجود اسی صورت میں قائم رہ سکتا ہے کہ یہ مملکت اسلامی بن جائے۔

(۲) مملکت کے اسلامی بننے کا ایک ہی طریق ہے کہ ایسا ضابطۂ قوانین مرتب ہو سکے جسے سب اسلامی تسلیم کر لیں۔

(۳) اس قسم کے ضابطہ کے مرتب ہونے کی وہی بنیاد ہو سکتی ہے جو تمام مسلمانوں کے نزدیک متفق علیہ ہو۔

(۴) یہ بنیاد قرآنِ عظیم کے سوا کوئی اور نہیں ہو سکتی۔

قرآنِ کریم کی رو سے متفق علیہ ضابطۂ قوانین کس طرح مرتب ہوگا۔ اسے ہم متعدد بار تفصیل سے بیان کر چکے ہیں۔ اگر مملکت نے اس اصول کو تسلیم کر لیا تو ہم اس کی تفاصیل ایک بار پھر پیش کر دیں گے۔ اصولاً بات وہی ہے جسے علامہ اقبالؒ نے ان الفاظ میں بیان کیا تھا کہ:۔

> اس سوال کا جواب (کہ کیا کوئی مملکت آج بھی اسلامی بن سکتی ہے) یقیناً اثبات میں ہونا چاہیئے بشرطیکہ اسلامی دنیا اس کی طرف عمرؓ کی روح کو لے کر بڑھے۔ وہ عمرؓ جو اسلام کا سب سے پہلا تنقیدی اور حریت پسند قلب ہے۔ وہ جسے رسول اللہؐ کی حیاتِ طیبہ کے آخری لمحات میں یہ کہنے کی جرأت نصیب ہوئی کہ:۔
>
> حسبنا کتاب اللہ (ہمارے لئے خدا کی کتاب کافی ہے)۔
>
> (خطباتِ تشکیلِ جدید)

طلوعِ اسلام اس حقیقت کو تیس سال سے دہرائے چلا جا رہا ہے۔ اسے اس نے ایک بار پھر اس شرح و بسط سے پیش کرنے کی ضرورت اس لئے محسوس کی کہ بہی خواہانِ پاکستان کا وہ طبقہ جس کی طرف ہم نے پہلے اشارہ کیا ہے، یہ نہ کہے کہ تم نے ہمیں اس خطرہ سے بروقت متنبہ کیوں نہ کیا؟ ہمیں اس حقیقت پژوہی اور بہی خواہی کا جذبہ مجبور کر رہا ہے۔ ہم نے اپنا فریضہ ادا کر دیا ہے ؎

وفا خطا تھی! خطا ہم نے زندگی بھر کی! اب اس کے بعد جو مرضی ہو بندہ پرور کی

حقائق و عبر

۱۔ جنابِ شیخ کے نقشِ قدم ،،......

مدعا حاصل کرنے کے لئے حضرات علماء کرام کو کس حد تک جانا پڑتا ہے، اس سلسلہ میں جماعت اہلحدیث کے ترجمان ہفت روزہ "الاعتصام" (لاہور) کی ۲۶ راگست ۱۹۷۷ء کی اشاعت میں شائع شدہ حسبِ ذیل شذرہ دلچسپی سے پڑھنے کے قابل ہے۔ اس کا عنوان ہے "سیاسی علماء" ہے۔ شذرہ ملاحظہ فرمائیے:۔

سیاسی علماء کے متعلق ہم نے پہلے بھی بعض اہم موقعوں پر لکھا ہے کہ سیاسی اغراض کے لئے دینی عقائد و معاملات میں لچک اور مداہنت روا رکھنا سخت نقصان دہ ہے۔ اس سے جہاں علمائے حق کا کردار داغدار ہوتا ہے اور اس تاریخ پر حرف آتا ہے جو علمائے حق نے نازک سے نازک حالات میں بھی حق کا علم بلند کرکے اپنے خونِ جگر سے رقم کی ہے؛ وہاں دوسری طرف اہلِ زیغ کے مسلکِ ضلال کے لئے "سہارا" مہیا ہو جاتا ہے۔

سیاسی معاملات میں زیادہ سے زیادہ ہمنوائی اور اشتراکِ فکر و عمل کی اہمیت و افادیت سے انکار نہیں بلکہ بعض حالات میں یہ ناگزیر ہو جاتا ہے جس طرح کہ جنوری ۷۷ء سے اب تک کے حالات اس کے متقاضی رہے اور ہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ دینی معاملات میں بھی ہم اس کا مظاہرہ کریں اور ایک شخص جس بات کو یکسر غلط سمجھتا آ رہا ہو، سیاسی اشتراک کی وجہ سے، وہ اس غلط بات کو کرنے میں بھی کوئی شرعی قباحت محسوس نہ کرے۔

اس تمہید کی ضرورت مولانا مفتی محمود صاحب صدر پاکستان قومی اتحاد اور مولانا عبیداللہ انور کے اس طرزِ عمل سے محسوس ہوئی ہے کہ ان ہر دو حضرات نے خواجہ علی ہجویریؒ کی قبر پر آستانہ بوسی کا "شرف" حاصل کیا ہے۔ حالانکہ بزرگانِ دین کی قبروں پر اس طرح کی حاضری ان کے مسلک و عقیدے کی رُو سے غلط ہے بلکہ مؤخر الذکر مولانا کے تو مرحوم والد مولانا احمد علی صاحب "حضرت علی ہجویریؒ" کی موجودہ قبر کو ہی مصنوعی بتلاتے تھے اور اوّل الذکر نے (اخباری اطلاع کے مطابق) قبر پر "دستار بندی" کا شغل فرمایا اور حلوہ تقسیم کیا جو غالباً چڑھاوا ہونے کی وجہ سے اهل به لغير الله کے ضمن میں آتا ہے۔

بہرحال ہم علمائے دیوبند کے اس طرزِ عمل کو سخت ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتے ہیں، کیونکہ اس سے شرک و بدعت کو تقویت پہنچتی ہے اور اس توحید کو نقصان پہنچتا ہے جس کی تبلیغ و تلقین علمائے حق کرتے آئے ہیں اور مذکورہ دیوبندی علماء بھی اپنے آپ کو انہی علماء کے سلسلے کی کڑی سمجھتے ہیں۔

۲- بدزبان سیاست

ہفت روزہ افریشیا (لاہور) کی ۱۸ اگست کی اشاعت میں، عنوان بالا کے تحت ایک شذرہ شائع ہوا ہے جس میں کہا یہ گیا ہے کہ موجودہ سیاست میں بدزبانی کس طرح عام ہو رہی ہے۔ لیکن اس تاسف اور تنبیہہ کے لئے خود جناب ناصح (افریشیا) نے جو زبان استعمال کی ہے، وہ قابلِ غور ہے۔ ارشاد ہے:

ذوالفقار علی آف لاڑکانہ وہ پہلا شخص ہے جس نے پاکستان کی سیاست میں بدزبانی اور بدمعاشی کو رائج کیا ہے۔ وہ چونکہ مزاجاً ایک لفنگا آدمی ہے اس لئے گالی گلوچ اور دشنام کی بے عزتی سے اسے راحت ملتی ہے۔ اقتدار میں رہ کر تو اس نے جس طرح پوری قوم کی بے عزتی کی۔ اس کی بیٹیوں کو رسوا کیا اور اس کے بزرگوں کو بے عزت کیا آپ سب کو معلوم ہے لیکن اقتدار سے محرومی سے بھی اسے عبرت نہیں ہوئی اور اس بدبخت نے لاہور کے چند بدمعاشوں کی مدد سے مولانا شاہ احمد نورانی کی بے عزتی کرنے کی کوشش کی۔ اگرچہ عوام کی نظروں میں جناب نورانی کی عزت و مرتبت میں ویسا ہی اضافہ ہوا ہے جیسے امام احمدؒ کی عزت و توقیر میں ہوا تھا لیکن اس سے یہ ضرور ثابت ہو گیا کہ ذوالفقار علی بدستور ایک لفنگا بدمعاش اور بدقماش آدمی ہے جس کی عبرت کی حس مرچکی ہے اور اس کی سیاست ایک غنڈے کی سیاست ہے۔ جناب جنرل ضیاء الحق نے یہ کہہ کر باعزت شہریوں کے دل جیت لئے ہیں کہ ہم اب تک تو سیاستدانوں کی زبان دیکھتے رہے ہیں اب ہر سیاستدان کے ساتھ اس کی پسندیدہ زبان میں سلوک کیا جائے گا، اسی لئے تو رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کسی کے ساتھ وہی سلوک کرو جو تم سے کیا جائے تو تمہیں پسند ہو لیکن یقین ہے کہ بدزبان ذوالفقار علی سے جو سلوک ہوگا وہ اسے ہرگز پسند نہ ہوگا۔

یہ ہے وہ اندازِ نصیحت جس سے "گنہگاروں کا وفقِ گناہ" اور بھی بڑھ جاتا ہے۔ بدزبانی کی اصلاح بدزبانی سے نہیں ہو سکتی۔

۳- ہمیں علیحدہ وطن کیوں حاصل کرنا پڑا؟

چونکہ ہمارے ہاں تحریکِ پاکستان کی کوئی مستند تاریخ آج تک مرتب نہیں ہوئی اس لئے اس سلسلہ میں بھانت بھانت کی بولیاں بولی جاتی ہیں۔ ان بولیوں میں ایک بات بطور قدرِ مشترک سامنے آتی ہے اور وہ یہ کہ مطالبۂ پاکستان

کا جذبہ محرکہ کیا تھا۔ اور اس کا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ ہندو کی تنگ نظری نے ہمیں علیحدگی پر مجبور کر دیا تھا — یعنی' پاکستان کے مطالبہ کی کوئی مثبت وجہ نہیں تھی۔ یہ ہمارے دین کا تقاضا نہیں تھا۔ یہ محض ہندو کی تنگ نظری تھی جس نے ہمیں ایسی روش اختیار کرنے پر مجبور کر دیا۔ اگر ہندو کشادہ ظرف ہوتا تو ہم کبھی علیحدہ نہ ہوتے۔ اس قسم کی باتیں جب کوئی عام آدمی کرتا ہے تو ہم انہیں چنداں اہمیت نہیں دیتے لیکن جب کوئی شخص اس دعوٰی کے ساتھ ایسا کہتا ہے کہ میں محرمِ رازِ درونِ پردہ ہوں۔ میں اس کا عینی شاہد ہوں' تو ہمیں بے حد تاسف ہوتا ہے۔ اور جب وہ انتہائی بے باکی سے ایک قدم اور آگے بڑھتا ہے اور کہتا ہے کہ ایسا خود قائدِاعظمؒ نے فرمایا تھا تو اس سے ہمیں بے حد صدمہ ہوتا ہے۔ اس قسم کا ایک مضمون' اخبار نوائے وقت کی ۱۴ر اگست ۱۹۷۷ء کی اشاعت میں شائع ہوا ہے جسے ہم انتہائی دکھ کے ساتھ درج ذیل کرتے ہیں:۔

"۱۴ر اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان میں ہر جگہ یومِ استقلال پاکستان بڑے جوش و خروش سے منایا گیا۔ پاکستان کا اوّلین دارالحکومت ہونے کا شرف کراچی کو نصیب ہوا۔ اور یہ بھی ایک نہایت اہم تاریخی حقیقت ہے کہ آزادی اور خود مختاری کے اعتبار سے پاکستان اپنے ہمسایہ ملک بھارت سے عمر میں ایک دن بڑا ہے کیونکہ ہماری آزادی کا اعلان ۱۴ر اگست ۱۹۴۷ء کو ہوا اور بھارت کی آزادی کا اعلان ۱۵ر اگست ۱۹۴۷ء کو کیا گیا۔

اس وقت غیر منقسم برصغیر کے وائسرائے اور گورنر جنرل لارڈ لوئی ماؤنٹ بیٹن تھے۔ چنانچہ وہ ۱۴ر اگست ۱۹۴۷ء کو بابائے قوم حضرت قائدِاعظم محمد علی جناح کو پاکستان کے پہلے گورنر جنرل کے اختیارات سونپنے کے لئے نئی دہلی سے کراچی پہنچے۔ فریئر ہال کراچی میں اس موقع پر ایک بہت بڑی تقریب کا اہتمام کیا گیا جس میں ماؤنٹ بیٹن نے حضرت قائدِاعظمؒ کو پاکستان کے گورنر جنرل کے اختیارات تفویض کئے۔ اس وقت سید ہاشم رضا کراچی کے ایڈمنسٹریٹر تھے سید صاحب ایک ممتاز علم دوست خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ چونکہ کراچی کے افسرِ اعلیٰ کی حیثیت سے وہ اس تقریب میں میزبان خصوصی تھے اس لئے وہ افسر تقریبات کے فرائض بھی انجام دے رہے تھے۔

سید ہاشم رضا کا کہنا ہے کہ جب حضرت قائدِاعظمؒ تقریب گاہ میں تشریف لائے تو مہمانوں سے ان کی ملاقات کرانے کا شرف بھی ان کو ہی حاصل ہوا۔ ان کا کہنا ہے کہ جب میں بابائے قوم کو لے کر اس میز پر پہنچا جس پر غیر ملکی اخباری نمائندے بیٹھے تھے تو نیویارک ٹائمز کے نمائندہ خصوصی نے بڑھ کر بابائے قوم کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور وفورِ عقیدت سے ان کا ہاتھ زور سے دبا کر بے ساختہ پکار اٹھا:۔

قائدِاعظمؒ میں مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ آخر کار آپ نے پاکستان لے ہی لیا!

سید ہاشم رضا کہتے ہیں کہ قائدِاعظمؒ نے یہ جملہ سن کر امریکی صحافی کا ہاتھ جھٹک دیا اور اپنے مخصوص لہجے میں جواب دیا:۔

میں نے اکیلے پاکستان حاصل نہیں کیا! پاکستان کے قیام کی جدوجہد میں میرا ایک روپے میں صرف دو آنے حصہ تھا۔ اس تحریک میں برصغیر کی مسلم قوم کا حصہ روپے میں سے چھ آنے کے برابر تھا اور قیامِ پاکستان میں اس برصغیر کی ہندو قوم کا حصہ ایک روپے میں آٹھ آنے کے برابر تھا!

امریکی صحافی قائدِاعظمؒ کے اس غیر متوقع ارشاد سے چونک اٹھا مگر بابائے قوم نے اس کی حیرت اپنی وضاحت سے

دور کر دی۔

بابائے قوم نے فرمایا:۔

جس زمانے میں مصر میں ـــــ سعد زاغلول پاشا کی حکومت تھی۔ مصر کے عیسائیوں نے اپنے حقوق کے تحفظ کے لئے تحریک شروع کر دی۔ ان کا تناسب آبادی ۱۳ فی صد تھا لیکن وہ بیس فیصد کے تناسب سے حقوق مانگتے تھے اور یہ قضیہ روز بروز سنگینی اختیار کر رہا تھا۔

سعد زاغلول پاشا نے اپنی پارٹی کا اجلاس طلب کیا اور اس میں اپنا یہ فیصلہ منظور کرا لیا کہ عیسائیوں کے ساتھ وہ خود اس مسئلے کا تصفیہ کر لیں گے۔ چنانچہ اپنی پارٹی سے یہ اختیار حاصل کر کے انہوں نے عیسائیوں کے مطالبے کا فیصلہ کرنے کے لئے گول میز کانفرنس طلب کر لی۔ یہ گول میز کانفرنس قاہرہ میں منعقد ہوئی۔ ابھی اس کانفرنس میں ایک ہی عیسائی نمائندے نے تقریر کی تھی کہ سعد زاغلول پاشا نے اسے ٹوک دیا اور کھڑے ہو کر اعلان کیا کہ عیسائی حقوق کے سلسلے میں بیس فی صد تناسب کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ لیکن ہم انہیں ۱۳ فیصد کی بجائے ۲۵ فی صد تناسب کا حق دیتے ہیں۔

سعد زاغلول پاشا کا یہ اعلان عیسائیوں کے لئے عید کی خوشی کی سی حیثیت رکھتا تھا۔ انہوں نے مسلمان حکمران لیڈر کو بے حد خراجِ تحسین پیش کیا۔ گول میز کانفرنس ختم ہو گئی۔ یہ ۱۹۲۳ء کا زمانہ تھا اس کو اب تقریباً ربع صدی گزر چکی ہے اور مصر میں اس دن کے بعد مسلمانوں اور عیسائیوں کے مابین کوئی بدمزگی یا کسی قسم کی کشیدگی پیدا نہیں ہوئی کیونکہ عیسائی ۲۵ فیصد کا تناسب حاصل کر کے بھی ۷۵ فیصد مسلمانوں کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے۔

قائدِ اعظمؒ نے فرمایا:۔

بعینہٖ یہی مسئلہ برصغیر کا بھی تھا۔ مسلمان بلحاظ تناسب آبادی ہندو قوم سے کہیں زیادہ اقلیت میں تھے مگر ہندو قیادت بھی سعد زاغلول پاشا جیسی فراخ دلی کا عملی ثبوت پیش کرتی تو مسلمانانِ برصغیر کو علیحدہ اور خود مختار وطن حاصل کر کے اپنے آپ کو محفوظ رکھنے کی ضرورت کیوں محسوس ہوتی؟"

ہم صاحبِ مقالہ سے صرف اتنا پوچھنا چاہتے ہیں کہ کیا ان کی نظروں سے قائدِ اعظمؒ کی (۱۹۳۷ء سے ۱۹۴۷ء تک پھیلی ہوئی بلکہ تشکیلِ پاکستان کے بعد کی بھی) تقاریر، خطبات اور بیانات میں سے کوئی ایک بھی نہیں گذری، جو انہیں معلوم ہو جاتا کہ قائدِ اعظمؒ نے اس سوال کا جواب کیا دیا تھا کہ ہم نے پاکستان کیوں مانگا تھا؟......

ہمیں زیادہ دکھ اس امر کے احساس سے ہوتا ہے کہ ہماری آج کی صحافت، کل کو تاریخ کی مستند شہادت بن جائے گی اور ہماری آنے والی نسلیں اسی تاریخ سے یہ اندازہ لگائیں گی کہ مطالبۂ پاکستان کا جذبۂ محرکہ کیا تھا!

۴۔ امیر جماعت کے اختیارات

مودودی صاحب نے امیر جماعتِ اسلامی کی پوزیشن اور مقام کے متعلق تحریر فرمایا تھا:۔

جب امیر کو چن لیا جائے گا تو اس کو سیاہ و سفید کے اختیار ہوں گے۔ امیر کو مشورہ کے ساتھ کام کرنا ہوگا

عموماً مجلس کے فیصلے کثرتِ رائے سے ہوں گے۔ مگر اسلام تعداد کی کثرت کو حق کا معیار تسلیم نہیں کرتا۔ اسلام کے نزدیک یہ ممکن ہے کہ ایک اکیلے شخص کی رائے پوری مجلس کے مقابلے میں برحق ہو۔ اور اگر ایسا ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ حق کو اس لئے چھوڑ دیا جائے کہ اس کی تائید میں ایک جمِ غفیر نہیں ہے۔ لہٰذا امیر کو حق ہے کہ اکثریت کے ساتھ اتفاق کرے یا اقلیت کے ساتھ۔ اور امیر کو یہ بھی حق حاصل ہے کہ پوری مجلس سے اختلاف کر کے اپنی رائے پر فیصلہ کرے۔[1]

(اسلام کا نظریۂ سیاسی۔ صفحہ ۴۶-۴۵)

انہوں نے تو یہاں تک بھی کہہ دیا تھا کہ:-

اسلامی نقطۂ نظر سے، اقامتِ دین کی سعی کرنے والی جماعت میں جماعت کے اولی الامر کی اطاعت فی المعروف دراصل اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کا ایک جز ہے۔ (ہدایات۔ صفحہ ۲۳)

آپ نے ملاحظہ فرما لیا کہ (مودودی صاحب کے نزدیک) اسلام کی رو سے، امیر جماعت کا مقام کیا ہے اور اس کے اختیارات کیا؟ اب ایک حالیہ واقعہ کی طرف آئیے۔ گذشتہ اگست میں (پروفیسر غفور صاحب اور) امیر جماعتِ اسلامی، میاں طفیل محمد صاحب نے کہا کہ جماعتِ اسلامی، متحدہ محاذ میں شامل دیگر پارٹیوں کے ساتھ ایک پارٹی میں مدغم ہونے کے لئے تیار ہے۔ اس پر مودودی صاحب سخت برہم ہو گئے اور فرمایا:-

پچھلے چند روز سے جماعتِ اسلامی کے دو نہایت ذمہ دار عہدے داروں کے بیانات اخبارات میں شائع ہو رہے ہیں کہ قومی اتحاد کی جماعتیں اگر مل کر ایک جماعت بن جائیں تو جماعتِ اسلامی اس میں مدغم ہونے کے لئے تیار ہے یہ باتیں قطعی طور پر دستور جماعتِ اسلامی کے خلاف ہیں۔ ہمارے دستور میں امیر اور مجلسِ شوریٰ اور تمام عہدیدار نظامِ جماعت اور تحریکِ اسلامی کو چلانے کے لئے مقرر کئے جاتے ہیں نہ کہ اس کو ختم کر دینے اور کسی اور جماعت میں مدغم کرنے کے لئے۔ مولانا مودودی نے کہا کہ جماعت میں آخری فیصلے کرنے کے لئے اختیارات صرف ارکان کے اجتماعِ عام کو ہی حاصل ہیں، اس کے فیصلے سے پہلے کوئی شخص بطور خود ایسے اعلانات کرنے کا حق نہیں رکھتا جو جماعت کے مستقل وجود کو ختم کر دینے کے ہم معنی ہوں۔ (نوائے وقت مورخہ ۱۷/ اگست ۱۹۷۷ء)

ہم اس واقعہ کا کوئی نوٹس نہ لیتے کیونکہ یہ جماعتِ اسلامی کا داخلی معاملہ تھا۔ لیکن مودودی صاحب نے امیرِ جماعت کی حیثیت اور اطاعت کے متعلق "اسلامی نقطۂ نگاہ" سے بات کی تھی۔ اس لئے اس تحقیق کی ضرورت پیش آئی کہ اسلام کی رو سے صحیح پوزیشن کیا ہے؟

۵۔ اسلام میں عورت کا مقام

پچھلے دنوں، جماعتِ اسلامی کے پروفیسر غفور احمد صاحب نے، ایک انٹرویو میں تفصیل سے بتایا کہ قومی اتحاد برسرِ اقتدار

---

[1] حاشیہ:— اس سے مودودی صاحب کی "جمہوریت" کا بھی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

آکر کیا کرے گا۔ اس سلسلہ میں انہوں نے عورتوں کے حقوق کے ضمن میں فرمایا:-

خواتین کو باعزت مقام دیا جائے گا۔ انہیں تجارتی جنس نہیں بنایا جائے گا۔ ہم ان کے لئے روزگار کے باعزت مواقع فراہم کریں گے۔ مثلاً ڈاکٹر، انجینئر اور تعلیم کے بعض شعبے خواتین کے لئے مختص ہوں گے۔ تجارتی دفاتر میں جہاں عورتیں کام کر رہی ہیں، ان کو سہولت دی جائے گی تاکہ باوقار طریقے سے وہ اپنا کام کر سکیں۔ (نوائے وقت - ۲ ستمبر ۱۹۷۷ء)

ہم پروفیسر صاحب سے دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ ایسا کہنے سے پہلے انہوں نے اس پر بھی غور کر لیا تھا کہ اس باب میں مودودی صاحب کا فیصلہ کیا ہے۔ ان کا ارشاد ہے:-

اسلام کا اصول یہ ہے کہ عورت اور مرد، عزت اور احترام کے لحاظ سے برابر ہیں۔ اخلاقی معیار کے لحاظ سے بھی برابر ہیں۔ آخرت میں اپنے اجر کے لحاظ سے بھی برابر ہیں۔ لیکن دونوں کا دائرۂ عمل ایک نہیں ہے۔ سیاست اور ملکی انتظام اور فوجی خدمات اور اس طرح کے دوسرے کام مرد کے دائرۂ عمل سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس دائرے میں عورت کو گھسیٹ لانے کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ یا تو ہماری خانگی زندگی بالکل تباہ ہو جائے گی جس کی بیشتر ذمہ داریاں عورتوں سے تعلق رکھتی ہیں یا پھر عورتوں پر دُہرا بار ڈالا جائے گا کہ وہ اپنے فطری فرائض بھی انجام دیں جن میں مرد قطعاً شریک نہیں ہو سکتا، اور پھر مرد کے فرائض کا بھی نصف حصہ اپنے اوپر اٹھائیں۔

آگے چل کر لکھتے ہیں:-

اسلام میں اگر جنگ کے موقع پر عورتوں سے مرہم پٹی کا کام لیا گیا ہے تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ امن کی حالت میں عورتوں کو دفتروں اور کارخانوں اور کلبوں اور پارلیمنٹوں میں لا کھڑا کیا جائے مرد کے دائرۂ عمل میں آکر عورتیں کبھی مردوں کے مقابلے میں کامیاب نہیں ہو سکتیں، اس لئے کہ وہ ان کاموں کے لئے بنائی ہی نہیں گئی ہیں۔ ان کاموں کے لئے جن اخلاقی اور ذہنی اوصاف کی ضرورت ہے وہ دراصل مرد میں پیدا کئے گئے ہیں۔ عورت مصنوعی طور پر مرد بن کر کچھ تھوڑا بہت ان اوصاف کو اپنے اندر ابھارنے کی کوشش کرے بھی تو اس کا دُہرا نقصان خود اس کو بھی ہوتا ہے اور معاشرہ کو بھی۔ اس کا اپنا نقصان یہ ہے کہ وہ نہ پوری عورت رہتی ہے، نہ پورا مرد بن سکتی ہے اور اپنے اصل دائرۂ عمل میں، جس کے لئے وہ فطرتاً پیدا کی گئی ہے ناکام رہ جاتی ہے۔ معاشرہ اور ریاست کا نقصان یہ ہے کہ وہ اہل کارکنوں کے بجائے نااہل کارکنوں سے کام لیتا ہے اور عورت کی آدھی زنانہ اور آدھی مردانہ خصوصیات سیاست اور معیشت کو خراب کر کے رکھ دیتی ہیں۔

(رسائل و مسائل۔ حصہ چہارم۔ صفحہ ۲۶۱ - ۲۶۰)

محترم پروفیسر صاحب، غالباً اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے کہ جب حالیہ تحریک میں خود مودودی صاحب کی بیگم صاحبہ کے زیرِ قیادت، خواتین نے اتنے جلوس نکالے تھے تو اسلام میں اس کی اجازت ہی ہوگی!

۶۔ اس کا کچھ انتظام کرنا ہوگا!

مفتی محمود صاحب کی جمعیت علماء اسلام کے ایک معزز رکن، مولانا نعمت اللہ صاحب، (ممبر سابق قومی اسمبلی) نے اسمبلی کی ایک نشست میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا تھا:۔

غلامی کو منسوخ کرنا خلافِ اسلام ہے۔ جو شخص ایک سے زیادہ بیویوں کی استطاعت نہ رکھتا ہو، ایسا انتظام کیا جائے کہ وہ کم از کم ایک لونڈی رکھ سکے۔ (پاکستان ٹائمز۔ یکم مارچ ۱۹۷۳ء)

۷۔ ایک گمراہ کن باطل دلیل

مسٹر بھٹو سے متعلق، رٹ درخواست کے سلسلہ میں، سپریم کورٹ کے فیصلہ اور وکلاء حضرات کے دلائل میں بعض نکات تبصرہ کے متقاضی ہیں۔ لیکن اس تبصرہ کو ہم مناسب وقت تک ملتوی رکھتے ہیں۔ البتہ، مسٹر بروہی کی ایک دلیل ایسی ہے جس پر بلا تاخیر تنقید ضروری ہے۔ انہوں نے، دورانِ بحث کہا کہ:۔

ہر نظریہ یا تصور (CONCEPT) اضافی (RELATIVE) ہوتا ہے۔ مثلاً نیوٹن کے نظریۂ کششِ ثقل کی رو سے زمین پر ہر چیز کا وزن ہوتا ہے، لیکن ہمارے زمانے میں، فضائی سفر میں ایک مقام ایسا آجاتا ہے جہاں کششِ ثقل کا احاطہ ختم ہو جاتا ہے اور کسی چیز کا وزن باقی نہیں رہتا۔ لہٰذا، وزن ایک اضافی شے ہے۔ (پاکستان ٹائمز۔ ۱۳ اکتوبر ۱۹۷۷ء)

بروہی صاحب اپنی وکیلانہ بحث کے سلسلہ میں جو مناسب سمجھیں کہیں، ہمیں اس سے غرض نہیں۔ لیکن کسی دلیل کو کلیہ کے طور پر پیش کرتے وقت انہیں بڑی احتیاط برتنی چاہیئے۔ انہوں نے کہا ہے کہ ہر نظریہ یا تصور اضافی ہوتا ہے تو یہ کلیہ باطل اور گمراہ کن ہے۔ اسلام اور سیکولرازم میں بنیادی فرق یہ ہے کہ سیکولرازم میں ہر نظریہ اضافی یا تغیر پذیر ہو سکتا ہے لیکن اسلام کے بنیادی تصورات اور نظریات مطلق —— (ABSOLUTE) اور غیر متبدل ہوتے ہیں —— حق کہتے ہی اسے ہیں جو مطلق اور غیر متبدل ہو۔ اگر اس کلیہ کو صحیح تسلیم کر لیا جائے کہ ہر نظریہ یا تصور اضافی ہو جاتا ہے تو اسلام اپنی جڑ بنیاد سے اکھڑ جاتا ہے۔

بروہی صاحب نے مثال مظہرِ فطرت کی پیش کی ہے اور اس سے کلیہ ایسا مستخرج کیا ہے جس کا اطلاق خارجی کائنات ہی نہیں بلکہ انسانی زندگی کے ہر شعبے پر یکساں ہوتا ہے۔ یہ طریقِ استخراج بجائے خویش بڑا بودا اور سطحی ہے۔

بروہی صاحب کی دلیل، قوانینِ فطرت کی رو سے بھی غلط ہے۔ قانون کی تعریف یہ ہے —— (IF — THEN — ALWAYS) —— یعنی اگر یہ شرائط پوری ہو جائیں تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا —— اور ہمیشہ ایسا ہی ہوگا۔ بروہی صاحب کی پیش کردہ مثال میں کہا جائے گا کہ قانونِ فطرت یہ ہے کہ اگر کوئی چیز

کرۂ ارض کے حیطۂ کششِ ثقل کے اندر ہو تو اس کا وزن ہوتا ہے۔ اگر وہ اس سے باہر نکل جائے تو اس کا وزن نہیں رہتا ——— اور ایسا ہمیشہ ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے یہ نہیں کہا جائے گا کہ وزن اضافی شے ہے۔ صحیح طور پر یہ کہا جائے گا کہ وزن، مشروط چیز (CONDITIONAL) ہے۔

یاد رکھیئے۔ وحی کی رو سے عطا کردہ (قرآنی) اصول و اقدار مطلق اور غیر متبدل ہیں۔ یہ نہ اضافی ہیں، نہ تغیر پذیر۔ اور جو قانون ان اصول و اقدار پر مبنی ہوگا اس کی بھی یہی کیفیت ہوگی۔ یہی وہ بنیادی نکتہ ہے جو اسلامی نظام اور سیکولر نظام میں خطِ امتیاز ہے۔

۸۔ قدمِ اوّل ہی غلط سمت کی طرف

اخبارات میں حسبِ ذیل خبر شائع ہوئی ہے:-

> اسلامی نظریہ کی مشاورتی کونسل نے قتل، اقدامِ قتل اور مہلک ہتھیار سے زخم لگانے کے جرائم کو قابلِ مصالحت قرار دینے پر اصولی طور پر اتفاق کر لیا ہے اور ایک بل کے مسودہ کو آخری شکل دیدی ہے۔ جس کے تحت مصالحتی بورڈ تشکیل دیئے جائیں گے جو خالصتہً اسلامی جذبہ سے لوگوں کو اپنے جھگڑے خود طے کرنے میں مدد دیں گے۔ فوجداری دفعات میں ضروری ترامیم کرنے کے لئے ایک کمیٹی بھی قائم کی جائے گی...... آج بحث و تمحیص کے دوران اسلامی نظریہ کی کونسل نے اصولی طور پر تسلیم کر لیا کہ تعزیراتِ پاکستان کی دفعات ۳۰۲ (قتل) ۳۰۷ (اقدامِ قتل) ۳۲۵ (تیز دھار آلے سے شدید زخمی کرنا)۔ ۳۲۶ (کند آلے سے شدید زخمی کرنا) کو قابلِ مصالحت جرائم قرار دے دیا جائے۔ کیونکہ ایسا کرنا اسلامی اصولوں کے عین مطابق ہے۔ (نوائے وقت۔ ۲۸ دسمبر ۱۹۷۷ء)

اسلامی نظریات کی کونسل کی تشکیلِ جدید کے بعد، موجودہ قوانین کو، اسلامی بنانے کے سلسلہ میں یہ پہلا اقدام ہے جو قوم کے سامنے آیا ہے اور ہمیں انتہائی افسوس، بلکہ صدمہ کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ یہ پہلا قدم ہی قرآنِ مجید کے ارشاد کے خلاف ہے۔ قرآنِ کریم نے صرف قتلِ خطا کے جرم کے متعلق کہا ہے کہ اس میں سزائے موت کے بجائے دیت (خون بہا) کی اجازت ہے قتلِ عمد میں اس کی قطعاً اجازت نہیں (ملاحظہ ہو سورۃ النساء۔ آیات ۹۲، ۹۳ — ۴/۹۲-۹۳) اس سے واضح ہے کہ، قرآنِ کریم کی رو سے، قتلِ خطا میں تو مصالحت کی اجازت ہے، قتلِ عمد میں اس کی اجازت نہیں۔ لیکن نظریاتی کونسل کی تجویز جس شکل میں سامنے آئی ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انہوں نے قتلِ عمد اور قتلِ خطا میں کوئی تمیز و تفریق نہیں کی؛ دونوں کو قابلِ مصالحت جرم قرار دے دیا ہے۔ یہ تجویز قرآنِ کریم کی نصِ صریح کے خلاف ہے۔ حیرت ہے کہ علماء اور دیگر دانشوروں پر مشتمل اتنی بڑی کونسل کی نگاہوں سے قرآنِ مجید کی یہ دو آیات اوجھل رہیں۔ ہم اس کونسل سے درخواست کریں گے کہ وہ از راہِ کرم اپنی تجویز پر نظرِ ثانی کریں اور قتلِ عمد اور قتلِ خطا میں فرق کر کے اپنی تجویز کو از سرِ نو مرتب کریں۔ اگر ان کی موجودہ تجویز کے مطابق قانون پاس ہوگیا تو یہ قرآنِ کریم کی صریح مخالفت ہوگی۔

ریکارڈ میں رکھئے

اخبارات میں شائع ہونے والی خبروں کی عمر ایک آدھ دن سے زیادہ نہیں ہوتی لیکن ان میں بعض خبریں ایسی اہم ہوتی ہیں کہ انہیں مستقل طور پر ریکارڈ میں رکھنا چاہیئے۔ ذیل میں ہم اسی قسم کی چند ایک خبریں بلا تنقید و تبصرہ درج کرتے ہیں۔ ان پر تنقید یا تبصرہ اپنے وقت پر کیا جائے گا۔

۱۔ مودودی صاحب

مودودی صاحب نے انگریزی اخبار پاکستان ٹائمز کے ایک نمائندہ کو انٹرویو دیتے ہوئے ایک سوال کے جواب میں فرمایا:۔

جو لوگ تحریک پاکستان کی صفِ اوّل میں شامل تھے وہ ہمیں سچے مسلمان نظر نہیں آتے تھے۔ ہمارے دل میں اس تحریک (کے اسلامی ہونے) کے متعلق شکوک کی یہ وجہ تھی، ہم (صرف) قائداعظمؒ کے خلاف نہیں تھے۔ ہم اس پوری کی پوری قیادت کے خلاف تھے جو تحریک پاکستان کو چلا رہی تھی۔

(پاکستان ٹائمز۔ مورخہ ۲۵-$\frac{9}{77}$)

اس پر روزنامہ نوائے وقت نے (جسے بالواسطہ جماعتِ اسلامی کا نقیب سمجھنا چاہیئے) اپنی اشاعت بابت ۲۷ر ستمبر کے اداریہ میں حسبِ ذیل تبصرہ شائع کیا۔

اس آخری گذارش کی ضرورت حتمی طور میں قومی اتحاد کے قیام کے ساتھ ہی محسوس ہونے لگی تھی لیکن اب ایک بزرگ سیاستدان اور عملی سیاست سے ریٹائر ہونے کے باوجود جماعتِ اسلامی کی حد تک اہم ترین شخصیت مولانا مودودی نے ایک مقامی انگریزی معاصر سے خصوصی انٹرویو میں تحریک پاکستان کی ساری لیڈرشپ کے مسلمان نظر نہ آنے کے سلسلہ میں جو کچھ کہا ہے اس کے باعث ہمیں افسوس کے ساتھ یہ سمجھنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ قوم و ملک جس نازک مرحلے سے گزر رہے ہیں، اس کے پیشِ نظر ایسی جیسے متنازعہ اور نامناسب باتوں کا اصرار کے ساتھ اظہار نہیں کرنا چاہیئے۔ ایسی باتوں سے مولانا مودودی کو کیا فائدہ پہنچتا ہے؟ یہ تو وہ خود ہی جانتے ہیں، لیکن اس طرح وہ اپنی جماعت کو موجودہ سیاسی تناظر میں ایک الجھن میں مبتلا کرنے کے علاوہ اپنے سیاسی حلیفوں کو بھی مشکل سے دوچار کر سکتے ہیں۔

معاصر مذکور نے اس تنقید کے آخر میں لکھا:

لیکن آپ ہیں کہ عین لڑائی میں پاکستان کے بانیوں کی سیاست کو غلط یا مسلمانی کو ناقص ثابت کرنے کی بحث اس طرح چھیڑ دیتے ہیں کہ یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ یہ عقل و تدبر کے فقدان کا نتیجہ ہے یا نیت کے ...... و خدا را دوسروں کی مجبوری سے ناجائز فائدہ نہ اٹھائیے، سیاسی تدبر سے کام لیجئے۔

اس تنقید کے سلسلہ میں نوائے وقت کی (۲) اکتوبر کی اشاعت میں حسبِ ذیل خبر شائع ہوئی:

جماعتِ اسلامی پاکستان کے بانی مولانا مودودی کی اہلیہ بیگم محمودہ مودودی نے نوائے وقت پر سخت تنقید کرتے ہوئے کہا ہے کہ کچھ دنوں سے اس اخبار کے صفحات مولانا مودودی پر کیچڑ اچھالنے میں مصروف ہیں اور یہ کہا جا رہا ہے کہ مولانا مودودی نے پاکستان کی مخالفت کی تھی۔ حالانکہ دو قومی نظریہ مولانا ہی کا ایجاد کردہ تھا۔ بیگم مودودی گذشتہ روز شاہ جمال میں خواتین کے ایک اجتماع سے خطاب کر رہی تھیں۔ انہوں نے کہا، یوں لگتا ہے جیسے نوائے وقت کو پیپلز پارٹی سے مالی امداد مل رہی ہے لیکن نوائے وقت کو یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ رقم زیادہ عرصہ تک نہیں چل سکے گی اور اس کے بعد نوائے وقت کا حشر بہت بُرا ہوگا۔ اس موقع پر بیگم مودودی نے جنرل ضیاء الحق کے ایک بیان کا حوالہ دیا جس میں کہا گیا ہے کہ گذشتہ تیس سالوں سے کسی بھی حکمران نے ملک میں اسلام کو عملی طور پر نافذ کرنے کی کوشش نہیں کی۔ بیگم صاحبہ نے کہا کہ قائدِاعظمؒ کا شمار بھی ان حکمرانوں ہی میں ہوتا ہے جنہوں نے ملک میں اسلام نافذ کرنے کے لئے کچھ بھی نہیں کیا۔ نوائے وقت کے ایڈیٹر میں اگر اتنی اخلاقی جرأت ہے تو وہ قائدِاعظمؒ کے اس اقدام کے خلاف بھی ایک اداریہ تحریر کرے۔

اور روزنامہ مساوات کی (۲) اکتوبر کی اشاعت میں حسبِ ذیل خبر:

لاہور ہائی کورٹ اور ڈسٹرکٹ و سیشن کورٹس کے ۱۰۰ وکلاء نے مشترکہ بیان میں مولانا مودودی کے اس انٹرویو کی سخت مذمت کی ہے جو انہوں نے ایک مقامی انگریزی روزنامے کو دیا ہے۔ اس انٹرویو میں مولانا مودودی نے کہا تھا کہ قائدِاعظمؒ سمیت تحریکِ پاکستان کے تمام قائدین سچے مسلمان نہیں تھے۔ ان وکلاء نے کہا ہے کہ تحریکِ پاکستان میں شاعرِ مشرق علامہ اقبالؒ، شہیدِ ملت لیاقت علی خان، علامہ شبیر عثمانی، مولوی تمیز الدین، سردار عبدالرب نشتر، مولوی فضل الحق، حسین سہروردی، مولانا عبدالحامد بدایونی، مولانا سلیمان ندوی، مولانا جمال میاں، پیر جماعت علی شاہ، پیر صاحب سیال شریف، پیر صاحب مانکی شریف اور دوسرے دیندار مسلمان رہنما پیش پیش تھے جن کا مذہبی اور سیاسی رتبہ مسلّم ہے۔ ان وکلاء نے چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر سے مطالبہ کیا ہے کہ وہ اس انٹرویو کا سختی سے نوٹس لیں جس میں انہوں نے قائدِاعظمؒ اور تحریکِ پاکستان کے دوسرے قائدین کے خلاف زہر افشانی کی ہے انہوں نے اس امر پر حیرت کا اظہار کیا ہے کہ وطنِ عزیز کو معرضِ وجود میں آئے تیس برس گذر چکے ہیں لیکن مولانا مودودی کے خیالات میں ذرہ بھر بھی تبدیلی نہیں، وہ آج بھی ملک اور تحریکِ پاکستان کے قائدین کے متعلق وہی نظریات رکھتے ہیں جن کا پرچار وہ ۱۹۴۷ء سے قبل کرتے تھے۔

اس وقت تک مسلم لیگ یا اس کے کسی رکن کی طرف سے، مودودی صاحب کے بیان پر کوئی تنقید یا تبصرہ نظر سے نہیں گذرا۔

مفتی محمود صاحب اور نظریہ پاکستان

معاصر نوائے وقت اپنے اسی اداریہ میں جس کا ذکر پہلے آ چکا ہے، لکھتا ہے:۔

اس سے قبل قومی اتحاد کے سربراہ مولانا مفتی محمود بھی اس معاصر سے اپنے خصوصی انٹرویو میں یہ کہہ چکے ہیں کہ وہ متحدہ ہندوستان میں زیادہ صوبائی خود مختاری میں مسلمانوں کا مفاد بہتر طور پر محفوظ سمجھتے تھے، اس لئے تحریک پاکستان کے مخالف تھے۔ تیس سال گزر جانے کے باوجود اگر تحریک پاکستان کی قیادت اور غرض و غایت کے متعلق آپ کے ذہن یا دل صاف نہیں ہو سکے، تو حقیقت تسلیم نہ کر سکنے کی صورت میں آپ اس معاملے میں خاموش بھی رہ سکتے ہیں، اور اگر کوئی سوال پوچھا جائے، تو آپ جواب دینے سے معذرت بھی کر سکتے ہیں۔ آخر نئے سرے سے ایسی بحثوں بلکہ کج بحثی کا دروازہ کھولنے (اور وہ بھی عین انتخابی مہم کے دوران میں) کی کیا تک ہے؟ (مورخہ ۲۷ ستمبر ۱۹۷۷ء)

مفتی محمود صاحب نے، خان عبدالقیوم خان کے ایک الزام کے جواب میں کہا کہ:۔

میں نے نظریۂ پاکستان کی مخالفت کی تھی ——— لیکن قیام پاکستان کے بعد میں نے گذشتہ تیس سال میں پاکستان کی خدمت کی ہے۔ (نوائے وقت ۲۰ ستمبر ۱۹۷۷ء)

اسی اخبار میں انہوں نے یہ بھی کہا کہ:۔

ملک میں سیاسی جدوجہد و نظریات اسلام اور سوشلزم کی جدوجہد ہے ..... پاکستان اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا تھا ورنہ پاکستان کے قیام کی ضرورت کیا تھی! (نوائے وقت - ۲۰ ستمبر ۱۹۷۷ء)

آپ لگے ہاتھوں اس خبر کو بھی نوٹ کر رکھئے جو تقسیم ہند سے پہلے، حیدر آباد (دکن) کے اخبار "رہبر دکن" کی ۲۹ اکتوبر ۱۹۴۵ء کی اشاعت میں شائع ہوئی تھی۔

مولانا حسین احمد صاحب نے مسلم لیگ میں مسلمانوں کی شرکت کو حرام قرار دیتے اور قائداعظم کو کافرِ اعظم کا لقب دیتے ہوئے حال ہی میں جو فتویٰ دیا تھا اس کا مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی دیوبندی نے اپنے مکتوب میں جو دہلی کے ایک روزنامہ میں شائع ہوا، حسب ذیل جواب دیا ہے..... (ہم یہ جواب درج نہیں کر رہے)۔ (بحوالہ "تحریک پاکستان اور نیشنلسٹ علماء" صفحہ ۱۱۲)

قارئین کو اتنا تو ضرور معلوم ہوگا کہ مولانا حسین احمد مدنی (مرحوم) اس دارالعلوم، دیوبند کے شیخ الحدیث تھے جس سے مفتی محمود صاحب نے سندِ فضیلت حاصل کی تھی۔ اور (مولانا مدنی) اس جمعیت العلماء ہند کے صدر بھی تھے جو نیشنلسٹ علماء کی نمائندہ جماعت تھی اور مفتی صاحب جس کے اہم رکن تھے۔

۳۔ مفتی صاحب اور سوشلزم

مفتی صاحب نے یہ بھی فرمایا ہے کہ:۔

اگر پاکستانی قوم کو سوشلزم سے رغبت ہوتی تو ہمیں علیحدہ ملک قائم کرنے اور لاکھوں جانوں کی قربانیاں دینے کی کیا ضرورت تھی۔ نہرو بھٹو سے بہت بڑا سوشلسٹ تھا۔ (نوائے وقت ۱/۱۰/۷۷)

دوسری جگہ فرمایا:۔

اگر ہم نے پاکستان میں سوشلسٹ معاشرہ لانا تھا تو بھٹو سے زیادہ نہرو سوشلسٹ تھا۔ پھر پاکستان کا جواز ہی کیا تھا۔ (نوائے وقت ۲۹/۹/۷۷)

مفتی صاحب غالباً، یہ بھول گئے کہ اسی سوشلسٹ نہرو کے متعلق (جس سے بچنے کے لئے آپ نے پاکستان بنایا تھا) مفتی صاحب کے استاذ (اور غالباً مرشد) مولانا حسین احمد مدنی کا ارشاد تھا کہ:۔

جواہر لعل ہندو ہے۔ اس نے کبھی نہیں کہا کہ میں مسلمان ہوں۔ اس کے باوجود وہ مسلمانوں کی حفاظت چاہتا ہے۔ (طلوعِ اسلام۔ اکتوبر ۱۹۶۴ء۔ ص ۲۴)

۴۔ مفتی صاحب اور روٹی کا مسئلہ

مفتی محمود صاحب نے ۲۵ ستمبر کو فرمایا کہ:۔

قومی اتحاد کی حکومت میں حکمران اس وقت تک کھانا نہیں کھائیں گے جب تک انہیں یقین نہ ہو جائے کہ ملک کے ہر شہری کو خوراک مل رہی ہے۔ اور یہی اسلام کا اصول ہے۔ (نوائے وقت ۲۵/۹/۷۷)

لیکن چار ہی روز بعد فرمایا کہ:۔

قومی اتحاد عوام کے ساتھ جھوٹے وعدے کرنے پر یقین نہیں رکھتا کہ عوام کو فی الفور روٹی مہیا کی جائے گی، ..... وہ معقول وقت کے اندر ہر ایک کو روٹی فراہم کرے گا۔ (نوائے وقت ۳/۹/۷۷)

۵۔ قرآن ہمارا منشور ہے

نوائے وقت بابت (۲۴) ستمبر ۱۹۷۷ء میں حسبِ ذیل خبر شائع ہوئی ہے:۔

پاکستان قومی اتحاد نے اعلان کیا ہے کہ ملک میں قرآنِ مجید کا نظام نافذ کرنے کی جدوجہد اب فیصلہ کن مرحلے میں داخل ہو گئی ہے۔ آج یہاں نشتر پارک میں ایک عظیم الشان اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے قومی اتحاد کے سربراہ مولانا مفتی محمود نے قرآنِ پاک کا ایک نسخہ ہاتھوں میں تھام کر کہا کہ کراچی کے باحمیت شہریوں نے مجھے یہ نسخہ پیش کیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ یہی کتابِ مقدس ہمارا منشور ہے۔ دنیا میں اس سے بڑھ کر کوئی منشور پیش نہیں کیا جا سکتا، میں یہی عظیم منشور آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں اور وعدہ کرتا ہوں کہ برسرِ اقتدار آنے کے بعد ہم اس پر عمل کریں گے۔

(اس کے دو ایک دن بعد انہوں نے فرمایا تھا کہ ہمارا منشور زیرِ ترتیب ہے اور مجلسِ عمل کی منظوری کے بعد شائع کیا جائیگا۔)

۶۔ نیشنل ڈیموکریٹک پارٹی اور نظامِ مصطفیٰ!

نیشنل ڈیموکریٹک پارٹی (جو قومی اتحاد میں شامل ہے) کے سربراہ محترم شیر باز مزاری سے پوچھا گیا کہ نظامِ مصطفیٰ سے کیا مراد ہے۔ اس کے جواب میں انہوں نے کہا کہ ہم اس کے متعلق کچھ نہیں جانتے۔
ہم تو ایک سیکولر قسم کا جمہوری معاشرہ چاہتے ہیں جس میں سب آرام سے رہ سکیں۔ کوئی غدار نہ قرار دیا جائے۔ (مساوات ۲۶ ۹/۷۷)

۷۔ مودودی صاحب کا انٹرویو

اس "ریکارڈ" کی شق علے میں آپ نے اس انٹرویو کا اقتباس ملاحظہ فرمایا ہے جو مودودی صاحب نے روزنامہ پاکستان ٹائمز کے نمائندہ کو دیا تھا۔ اس انٹرویو کا اردو ترجمہ، جماعتِ اسلامی کے ترجمان' ایشیا کی ۲ اکتوبر ۱۹۷۷ء کی اشاعت میں شائع ہوا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ اسے بھی ریکارڈ میں محفوظ کر لیا جائے۔ لیکن اس سے پہلے پاکستان ٹائمز میں شائع ہونے والے انٹرویو کے ذرا تفصیلی اقتباس کی ضرورت لاحق ہو گئی ہے: وہ یوں ہے:-

سوال:- اگر جیسا کہ آپ کہتے ہیں، دین کے قیام کے لئے مملکت کا اقتدار ضروری ہے' تو پھر آپ نے تحریکِ پاکستان کے لیڈروں کی مخالفت کیوں کی تھی؟

جواب:- ہمارے لئے اصل بات یہ ہے کہ اگر ہمیں ایک گز زمین ایسی مل جائے جہاں خدا کی مشیت کا غلبہ ہو تو وہ خطہ دوسروں سے زیادہ مقدس ہوگا۔ ہم چاہتے تھے کہ پورا ہندوستان سرزمینِ اسلام ہو لہٰذا، ہم اسلام کے نام پر حاصل کئے جانے والے ملک کی مخالفت کس طرح کر سکتے تھے؟ لیکن جو لوگ تحریکِ پاکستان کی صفِ اوّل میں شامل تھے وہ ہمیں سچے مسلمان نظر نہیں آتے تھے۔ ہمارے دلوں میں اس تحریک (کے اسلامی ہونے) کے متعلق شکوک کی یہ وجہ تھی۔ ہم قائدِ اعظمؒ ہی کے خلاف نہیں تھے۔ ہم اس پوری کی پوری قیادت کے خلاف تھے جو تحریکِ پاکستان کو چلا رہی تھی۔ جب پاکستان قائم ہو گیا تو ہم نے اسلامی نظام کے قیام کی جدوجہد جاری رکھی۔ (پاکستان ٹائمز ۲۵ ۹/۷۷)

آپ نے پاکستان ٹائمز میں شائع شدہ انٹرویو کا متعلقہ حصہ دیکھ لیا۔ اب دیکھئے کہ ایشیا میں یہ حصہ کس طرح شائع ہوا ہے۔ اس کا عنوان ہے:-

پاکستان ٹائمز کے خصوصی نامہ نگار کا مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب سے اہم انٹرویو

اس کے بعد اس کا متعلقہ حصہ یوں شائع ہوا ہے۔

تحریکِ پاکستان کے لیڈروں کی مخالفت کے بارے میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے مولانا مودودی نے کہا کہ سچی بات یہ ہے کہ اگر ہمیں ایک گز زمین ایسی مل جائے جہاں اللہ کے حکم پر عمل کیا جا سکے تو

یہ خطہ دوسرے خطوں سے زیادہ مقدس ہوگا۔ ہم چاہتے تھے کہ پورا ہندوستان سرزمین اسلام ہو۔ اس کے بعد ہم اسلام کے نام پر حاصل کئے جانے والے ملک کی کس طرح مخالفت کر سکتے تھے۔ جب پاکستان قائم ہو گیا تو ہم نے اسلامی نظام کے قیام کی جدوجہد جاری رکھی۔ (الخ)

(ایشیا۔ ۱۷ اکتوبر ۱۹۷۷ء۔ صفحہ)

آپ نے دیکھا کہ اس میں سے وہ حصہ غائب ہی کر دیا گیا ہے جس میں تحریکِ پاکستان کے لیڈروں کے سچے مسلمان نہ ہونے کا ذکر تھا۔ ایک صاحب نے بتایا ہے کہ جماعتِ اسلامی کے دوسرے ترجمان، روزنامہ جسارت (کراچی) میں بھی اس انٹرویو کا متعلقہ حصہ اس طرح شائع ہوا ہے جس طرح ایشیا میں شائع ہوا ہے۔ کچھ عرصہ بعد، پاکستان ٹائمز میں شائع ہونے والا انٹرویو تو لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل ہو جائے گا اور یہ حضرات، ایشیا (اور جسارت) میں شائع ہونے والا انٹرویو لوگوں کو دکھائیں گے اور کہیں گے کہ جو لوگ کہتے ہیں کہ مودودی صاحب نے تحریکِ پاکستان کے لیڈروں کے سچے مسلمان ہونے پر اعتراض کیا تھا' وہ کس قدر بہتان تراشی اور افترا پردازی سے کام لیتے ہیں۔ مولانا صاحب نے کبھی ایسا نہیں کہا تھا!

۸۔ روس اور مولانا عبید اللہ انور

انقلابِ روس کی ساٹھویں سالگرہ کی تقریب' ۵ نومبر ۱۹۷۷ء کو ہوٹل فلیٹیز (لاہور) میں روسی کونسل خانے کے زیرِ اہتمام منائی گئی۔ اس کی صدارت، (مولانا احمد علی مرحوم کے صاحبزادہ اور جمعیت العلمائے اسلام کے ایک ممتاز رکن) مولانا عبید اللہ انور صاحب نے فرمائی۔ انہوں نے اپنی صدارتی تقریر میں فرمایا:۔

برصغیر کے مسلمانوں کے لئے روس کا انقلاب اس لئے بہت اہمیت رکھتا ہے کہ انقلابِ اکتوبر کے بعد علامہ اقبال نے بھی اس جدوجہد کو خراجِ تحسین پیش کیا۔ خود میرے دادا مولانا عبید اللہ سندھی نے اس انقلاب کی پذیرائی فرمائی۔ وہ روس گئے۔ انہوں نے کہا روس نے اس انقلاب کی بدولت زبردست مادی ترقی حاصل کی۔ میری دعا ہے کہ اس کی یہ ترقی برقرار رہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ روسی روحانی جلا بھی حاصل کریں۔ مولانا عبید اللہ انورؒ نے کہا۔ ایک مسلمان کی حیثیت سے میں واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ اسلام بلا امتیازِ مذہب و نسل تمام انسانوں کو مساوی حقوق دینے کا قائل ہے۔ انقلابِ اکتوبر کی اس تقریب کے لئے ہال میں چاروں جانب لینن اور دوسرے روسی رہنماؤں کی تصاویر آویزاں کی گئی تھیں اور شرکاء میں روسی لٹریچر بھی تقسیم کیا گیا۔

(نوائے وقت ۶ نومبر ۱۹۷۷ء)

نوٹ:۔ علامہ اقبالؒ نے روس اور اس کی اشتراکیت کے خلاف جو کچھ کہا تھا مولانا صاحب نے اس کا ذکر نہیں کیا۔

۹۔ برطانیہ میں علمائے کرام کا ورود

نوائے وقت بابت ۱۴ر نومبر ۱۹۸۷ء میں ہمایوں ادیب صاحب کا مکتوب لندن شائع ہوا ہے ـــ اس کا اقتباس ملاحظہ فرمایئے :-

برطانیہ کے مختلف شہروں میں ایک ہزار کے لگ بھگ مساجد اور اسلامک سنٹرز ہیں۔ ان میں سے بیشتر پاکستانیوں نے قائم کیں اور وہ عربوں کے "عطیات" اور پاکستانیوں کے چندے سے چل رہی ہیں۔ لیکن ستر فی صد سے زیادہ مساجد اور اسلامک سنٹرز ایسے ہیں جن کے آئمہ کرام اور مولوی صاحبان بھارتی مسلمان ہیں۔ ان میں سے بیشتر باقاعدہ "اوپر" سے (بھارتی ہائی کمیشن سے) ہدایات حاصل کرتے ہیں۔ چنانچہ آجکل یہ ائمہ کرام اپنے خطبات میں "مسلمان بھائی بھائی" کی تلقین کرتے ہوئے یہ بھی کہتے ہیں کہ بھارت میں پاکستان سے زیادہ مسلمان ہیں۔ مذہب کی مکمل آزادی ہے۔ مسلمان اپنی مساجد میں لاؤڈ سپیکر پر اذان بھی دے سکتے ہیں اور نماز بھی ادا کر سکتے ہیں۔ آجکل برطانیہ میں دو عالم بھی تشریف لائے ہوئے ہیں۔ ان میں سے ایک مولانا حسین احمد مدنی کے فرزند ارجمند مولانا اسعد احمد مدنی ہیں۔ اور دوسرے مولانا احمد رضا خاں بریلوی کے پوتے مولانا ریحان رضا خاں بریلوی ہیں۔ اوّل الذکر تو قاہرہ سے لندن تک مولانا مفتی محمود کے ہم سفر بھی رہے تھے، وہ دیوبندی مدرسۂ فکر کے امام ہیں۔

۱۰۔ اسلامی جمہوریہ پاکستان کی عدالتیں

ڈیرہ غازی خاں میں مسلمانوں نے "احمدیوں" کی ایک مسجد کو یہ کہہ کر سر بمہر کر دیا کہ غیر مسلموں کو حق حاصل نہیں کہ مسلمانوں کی عبادت گاہ کے مشابہ عبادت گاہیں تعمیر کریں۔ ماتحت عدالتوں نے مسلمانوں کے حق میں فیصلہ دیا۔ احمدیوں نے اس کے خلاف لاہور ہائی کورٹ میں اپیل کی۔ ہائی کورٹ نے ایک مفصل فیصلہ میں لکھا :-

یہ مذہبی معاملات ہیں جن میں قانون کی عدالتیں دخل اندازی نہیں کر سکتیں۔ اس لئے سول جج کی عدالت میں دعویٰ کی بنیاد ہی غلط ہے۔ اسی طرح سول جج کے فیصلہ کو برقرار رکھنے کا جو فیصلہ ڈسٹرکٹ جج نے دیا ہے وہ بھی غلط ہے۔ (نوائے وقت ۱۴ $\frac{۱۱}{۷۷}$)

اسے نوٹ کر رکھئے کہ اسلامی جمہوریہ پاکستان کی عدالتیں مذہبی معاملات میں دخل اندازی نہیں کر سکتیں۔

۱۱۔ ارشادات قائداعظمؒ

قائداعظمؒ نے ۲۳ر اکتوبر ۱۹۴۷ء کو (جب وہ پاکستان کے گورنر جنرل تھے) رائٹر کے ایک نامہ نگار کو انٹرویو دیتے ہوئے فرمایا :-

پاکستان نہ کبھی اس معاملہ میں سرِ تسلیم خم کرے گا، نہ رضامند ہوگا کہ پاکستان اور ہندوستان میں اس قسم کا آئینی سمجھوتہ ہو جائے جس کی رو سے ان کا مرکز ایک بن جائے۔ اگر کسی طرف سے اس قسم کی کوشش ہو، جس سے ان دونوں مملکتوں کو زبردستی ملا دینا مطلوب ہو، تو ہمیں اسے سختی سے روک دینا چاہیئے۔

پھر انہوں نے فرمایا:۔

دو قومی نظریہ، محض ایک نظریہ نہیں، بلکہ ایک حقیقت ہے۔ ہندوستان کی تقسیم اس حقیقت پر مبنی ہے۔ (پاکستان ٹائمز۔ ۲۴ر اکتوبر ۱۹۷۷ء بحوالہ پاکستان ٹائمز۔ ۲۴ر اکتوبر ۱۹۷۷ء)

۱۲۔ پیشۂ وکالت

مسٹر اے۔ کے۔ بروہی نے سپریم کورٹ کے حالیہ مقدمہ میں، آئین کی عظمت کے ضمن میں جو دلائل دیئے وہ ان دلائل کی تردید کرتے تھے جو خود انہوں نے اس سے پہلے سپریم کورٹ ہی کے ایک مقدمہ (عاصمہ جیلانی کیس) میں پیش کئے تھے۔ اگلے دنوں وہ لندن تشریف لے گئے تو وہاں ان کے خلاف یہ اعتراض کیا گیا کہ انہوں نے خود اپنے ہی دلائل کی تردید کس طرح کر دی۔ انہوں نے جواب میں فرمایا کہ:۔

بیگم بھٹو کی درخواست کے سلسلہ میں پاکستان کے سپریم کورٹ کے سامنے پاکستان کے آئین کے ضمن میں انہوں نے جس مؤقف کی حمایت کی وہ محض ایک وکیل کا پیشہ ورانہ فرض تھا۔ انہوں نے مزید کہا کہ اگر دوسرا فریق ان سے رابطہ قائم کرتا اور ان کی فیس ادا کرتا تو وہ اسی شدومد کے ساتھ یہ کہتے کہ دوسرے فریق نے غلطی کی ہے۔ (چٹان۔ مورخہ ۲۸ر نومبر ۱۹۷۷ء)

۱۳۔ نہ نو من تیل ہو، نہ رادھا ناچے!

اس سوال کے جواب میں کہ کیا متحدہ محاذ میں شامل جماعتوں کا ادغام ایک جماعت میں ہو سکتا ہے، جمعیت العلمائے پاکستان کے جنرل سیکرٹری مولانا عبدالستار خان نیازی نے کہا:۔

جمعیت العلماء پاکستان کے آئین و منشور میں مقامِ مصطفیٰ کا تحفظ، منصبِ نبوت، اختیاراتِ نبوت، احاطہ اختیارِ نبوت اور نفاذ شامل ہے۔ ہم آخری دم تک اس مقصد کے لئے جدوجہد کریں گے۔ انہوں نے کہا کہ ہم چاہتے ہیں کہ دین کی جامع تعبیر کا راستہ کھلا رہنا چاہیئے۔ کیونکہ اگر کوئی ہمہ گیر، جامع، عالم گیر تعبیر نہ ہو تو عقیدہ و نظریہ پر مبنی سلطنت ایک مذاق بن کر رہ جاتی ہے۔ انہوں نے کہا کہ اگر اس جامع تعبیر کو سب جماعتیں قبول کر لیں تو ادغام

پہ کوئی اعتراض نہیں۔ بصورت دیگر ایسا ممکن نہیں۔ (نوائے وقت۔ ۳۰ نومبر ۱۹۷۷ء)
جب جمعیت العلماء پاکستان (بریلوی فرقہ) کے عقائد سامنے آئیں گے تو اس وقت لوگوں کو معلوم ہوگا کہ نیازی صاحب نے جو کچھ کہا ہے اس کا مطلب کیا ہے۔

۱۴۔ صرف اللہ کا حکم مانو

محترم بدیع الزمان کیکاؤس (ریٹائرڈ جج سپریم کورٹ) نے، اپنے ایک شذرہ میں جس کا عنوان ہے "اسلامی نظام کیسے نافذ ہوگا" فرمایا:۔

اس وقت ہر جانب سے صدا آ رہی ہے کہ نظام مصطفےٰ ؐ یا اسلامی نظام نافذ کیا جائے لیکن کم ہی پاکستانیوں کو معلوم ہوگا کہ اسلامی نظام نافذ کیسے ہوگا۔ میں ذیل میں بہت سادہ نسخہ درج کر رہا ہوں جس کے بعد اسلامی نظام کے نفاذ کے لئے پاکستان کو کسی اور چیز کی ضرورت نہ رہے گی۔ کیونکہ اس ترمیم کے بعد اعلیٰ عدالتیں خود تحقیق کرتی رہیں گی کہ قرآن و سنت میں کیا لکھا ہے اور اس کے مطابق عمل کرتی رہیں گی۔ البتہ میں کچھ اور ترمیمیں بھی بتاؤں گا جن سے ایک تو اعلیٰ عدالتوں کو آسانی ہوگی اور دوسرے شہریوں کے حقوق بھی محفوظ ہوں گے۔ اب میں وہ ترمیم بتاتا ہوں جس سے قرآن و سنت کا عملی نفاذ ہو جائے گا۔ ترمیم یہ ہے:۔

پاکستان کے آئین کے آرٹیکل نمبر ۲۶۰ میں مندرجہ ذیل تعریف کا اضافہ کیا جائے گا۔ "قانون کے معنی ہیں اللہ کا حکم اور اللہ کے حکم کے سوا کوئی قانون پاکستان میں نہ ہوگا۔" سچی بات یوں ہے کہ جو کچھ میں آرٹیکل نمبر ۲۶۰ میں درج کر رہا ہوں یہ وہی ہے جو پاکستان کی سپریم کورٹ دو مقدمات میں فیصلہ کر چکی ہے۔ سپریم کورٹ نے فیصلہ کر دیا ہوا ہے کہ پاکستان میں قانون صرف اللہ کا حکم ہے۔ لیکن اس فیصلے پہ عمل نہیں ہو رہا۔ آئین میں درج ہو گیا تو عمل لازماً ہو جائے گا۔ اس ترمیم سے نظام مصطفےٰ پورے کا پورا نافذ ہو جائے گا۔ اس ترمیم کے معنی وہی ہیں جو لا الٰہ الا اللہ کے ہیں کہ اللہ کا حکم مانتا ہوں اور اس کے سوا باقی ہر ایک کا حکم رد کرتا ہوں۔ اور قرآن پاک نے تو لا الٰہ الا اللہ کے علاوہ صاف الفاظ میں فرما دیا۔ "حکومت صرف اللہ کا حق ہے اور اللہ نے حکم دے دیا کہ تم اللہ کے سوا کسی کی محکومی اختیار نہ کرو گے۔" اگر مسلمان اللہ کا حکم نہ مانے تو کافر اور اللہ کے حکم کے ساتھ کسی اور کا حکم شامل کرے تو مشرک۔ کیونکہ قانون صرف اللہ کا حق ہے اور اگر ہم یہ حق کسی اور کو دیں تو گویا ہم نے اس کو اپنا خدا بنا لیا۔ عیسائی اپنے پیشواؤں کو قانون بنانے کا حق دیتے تھے۔ جس پر قرآن پاک نے فرمایا کہ عیسائیوں نے اپنے پیشواؤں کو خدا بنا لیا ہے۔ حضرت عدی بن حاتم جب ابھی عیسائی ہی تھے رسول اکرم ؐ کے پاس گئے اور کہا کہ "حضور! ہم اپنے پیشواؤں کو خدا تو نہیں بناتے" حضور نے فرمایا کیا تمہارے پیشوا یہ فیصلہ نہیں کرتے کہ کیا عمل تمہارے لئے جائز ہیں اور کیا ناجائز۔ حضرت عدی بن حاتم نے کہا

کہ ہاں ایسا تو وہ کرتے ہیں۔ تو حضورؐ نے فرمایا کہ یہی خدا بنانا ہے۔

پاکستان کے مصائب کی صرف ایک وجہ ہے کہ اس نے اللہ کا حکم ماننا چھوڑ دیا۔ جس دن میری اس ترمیم کو پاکستان قبول کرے گا انشاء اللہ تعالیٰ تمام معاملے سیدھے ہو جائیں اور اگر یہ ملک اپنی نافرمانی پر قائم رہا تو پھر اللہ تو بے نیاز ہے اگر سارے کے سارے انسان بھی اس سے منحرف ہو جائیں تو اس کی خدائی میں کوئی فرق نہیں پڑے گا نہ اس کے جلال میں نہ اس کی کبریائی میں نہ اس کی شان میں، وہ تو سبحان ہے قدوس ہے اور وہ تو ایسا ہے کہ انسان اس کا خیال کرے تو سکون حاصل ہو۔ تسبیح کرے تو زیادہ سکون اور جو سجدہ کرے تو سکون ہی سکون۔ جو بھی اچھی زندگی انسان کو ملتی ہے اللہ تعالیٰ کی شفقت ہے اور جو مصیبت آتی ہے انسان کے اپنے اعمال کی بدولت۔

جو ملک اللہ کے نام پر بنا، حیرانی کی بات ہے کہ آج تک ایک حکم اس میں اللہ کا نافذ نہ ہوا۔ میں نے قرآن و سنت کے نفاذ کے لئے جو رٹ دائر کی تھی اس میں آپ کو معلوم ہے کہ میں نے عدالت میں جا کر کیا کہا؟ میں نے عدالت کو کہا۔ میں صرف ایک بات کہنے آیا ہوں اور وہ یہ ہے کہ اللہ کے حکم کو قبول کر لو۔ میں اس سے زیادہ ایک لفظ بھی نہیں کہتا۔ اس امر کا فیصلہ کرنا تو آپ کا اختیار ہے کہ اللہ کا حکم کیا ہے۔ لیکن اس قدر میری مان لو کہ جو کچھ آپ کے خیال میں اللہ کا حکم ہے وہ کر دو۔ یہی بات میں نے ہائیکورٹ میں کہی اور یہی بات میں نے سپریم کورٹ میں کہی۔ (نوائے وقت ۲۶-۹-۷۷)

یہی بات طلوعِ اسلام کہے تو منکرِ شانِ رسالت قرار پائے۔

مذاہبِ عالم کی آسمانی کتابوں کی کہانی

وہ منفرد معلومات افزا کتاب جس کا پہلا ایڈیشن ایک عرصہ ہوا ختم ہو گیا تھا، دوبارہ شائع ہو گئی ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ دنیا بھر کے مذاہب کی مبینہ آسمانی کتابیں کس طرح مرتب ہوئیں۔ کن مراحل سے گذریں اور اب وہ کس شکل میں ہیں۔ تورات۔ انجیل۔ وید۔ دھرم شاستر۔ رامائن۔ مہابھارت۔ ژند اوستا (مذہب زرتشت)۔ بدھ مت کی کتابیں۔ جین مت کی کتابیں۔ اہلِ چین (کنفیوشس ازم) کی کتابیں۔ اہلِ جاپان (شنٹو ازم) کی کتابیں۔ ان کی پوری تاریخ اور آخر میں اس حقیقت کا تفصیلی بیان کہ قرآن مجید پہلے دن سے ایک مرتب کتاب کی شکل میں دنیا میں محفوظ چلا آ رہا ہے۔ اس کتاب سے جہاں ان مذاہب کے متعلق عجیب و غریب معلومات حاصل ہوں گی وہاں مفکرِ قرآن کی وسعتِ مطالعہ اور عمیق تحقیق کا بھی اندازہ ہو سکے گا۔

سفید کاغذ۔ بکس بورڈ کا کور اور گرد پوش۔ قیمت۔ ۱۲/ روپے (علاوہ محصول ڈاک)

ملنے کا پتہ (۱) مکتبہ دین و دانش چوک اردو بازار لاہور (۲) ادارہ طلوعِ اسلام۔ ۲۵/بی۔ گلبرگ ۲ لاہور

کراچی کے خریداران متوجہ ہوں!

ادارہ طلوع اسلام کی مطبوعات دفتر بزم طلوع اسلام "کمرہ نمبر ۱/۸۔ تاور مینشن بالمقابل میری ویدرٹاور۔ ایم اے جناح روڈ۔ کراچی نمبر ۳" (فون نمبر 238828) سے صبح ۹ تا ۵ بجے شام حاصل کی جاسکتی ہیں۔ نیز اس پتہ پر پوسٹ کارڈ تحریر کرکے بھی منگائی جاسکتی ہیں۔ (نمائندہ بزم کراچی)

ضرورتِ رشتہ

امور خانہ داری، سلائی و کڑھائی کی ماہر۔ اکیس (۲۱) سالہ دوشیزہ کے لئے موزوں (بالعموم کاروبار) رشتہ مطلوب ہے۔
خط وکتابت بصیغۂ راز۔
ی۔م۔ معرفت ادارہ طلوع اسلام۔
۲۵/بی۔ گلبرگ نمبر ۲۔ لاہور

ضروری اعلان

ہوش ربا مہنگائی کی وجہ سے یکم جنوری ۱۹۷۶ء سے طلوع اسلام کا سالانہ چندہ برائے خریداران پاکستان (۲۴) روپے اور قیمت فی پرچہ دو (۲) روپے ہوگی۔

(ناظم ادارہ طلوع اسلام۔ لاہور)

محترم پرویز صاحب کا درسِ قرآن

لاہور میں ہر جمعہ ۱/۲ ۹ بجے (فون 80800) ۲۵/بی۔ گلبرگ نمبر ۲ (نزد پولیس اسٹیشن)	**کمالیہ** میں ہر جمعہ ۱/۲ ۳ بجے سہ پہر (بذریعہ ٹیپ) بدفتر بزم طلوع اسلام (بالمقابل چکی) اقبال بازار (لائلپور)
لیبیا میں ہر ہفتہ کے دن بعد نماز مغرب کیپٹن غلام احمد رضوی کے مکان (نمبر ۲۵/۱۵ واسد ٹاؤن) واقع عقب گلی گرلز ہائی اسکول۔ (بذریعہ ٹیپ)	**جام پور** میں ہر جمعہ بعد نماز عشاء (بذریعہ ٹیپ) (ڈیرہ غازیخان) بطوبح جنرل اسٹور۔ اڈہ روڈ
کراچی میں (عارضی طور پر) ہر جمعہ ۱/۲ ۹ بجے صبح (بذریعہ ٹیپ) کمرہ نمبر ۱/۸ تاور مینشن بالمقابل میری ویدر ٹاور ایم اے جناح روڈ (سٹی فون نمبر 238828)	**ملتان** میں ہر جمعہ صبح ۱۰ بجے (بذریعہ ٹیپ) (فون 72071) دفتر شاہ سنز۔ بیرون پاک گیٹ
لائلپور میں ہر جمعہ ۵ بجے شام (بذریعہ ٹیپ) (فون 24974) ۶۵ کوتوالی روڈ (حیات سرجری کلینک)	**گجرات** میں ہر جمعہ بعد نماز جمعہ نیز بروز اتوار چار بجے شام بمقام ۱۲/۱/۱ بی۔ بھمبر روڈ (بذریعہ ٹیپ)
راولپنڈی میں ہر جمعہ ۵ بجے شام (بذریعہ ٹیپ) جی ۱۶۶ لیاقت روڈ۔	**جلالپور جٹاں** میں ہر جمعہ بعد نماز جمعہ (بذریعہ ٹیپ) (گجرات) دفتر بزم طلوع اسلام (بازار کلاں)

سجدۂ شکرانہ

(بدرگاہِ ربّ العرش)

محترمہ ثریا عندلیب

میرے عزیز بھائیو اور بہنو۔ سلام و رحمت!

آپ سب جانتے ہیں کہ امسال ملکی حالات کے سبب ہم اپنی عزیز ترین سالانہ طلوعِ اسلام کنونشن معمول کے مطابق منعقد نہیں کر سکے۔ اس محرومی سے ہمارے دل بوجھل ہو رہے تھے کہ ہم وابستگانِ درسِ قرآن کو یہ نوید جانفزا ملی کہ اپنے معلّمِ مشفق و مفکرِ قرآن باباجی کی جس نئی تصنیف کا ہمیں ساعت ساعت انتظار تھا وہ خدا تعالےٰ کی رحمت و استعانت سے پایۂ تکمیل کو پہنچ کر شائع ہو گئی ہے اور ہم تبویب القرآن ایسی تصنیفِ بے نظیر اور نعمتِ بے مثال سے مالا مال ہونے والے ہیں۔

اس خبرِ بہجت اثر کو سن کر احساساتِ مسرت و جذباتِ تشکر سے آنکھیں نمناک ہو گئیں دل بے اختیار پکار اٹھا۔ فَبِاَیِّ آلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰن۔

آج ہم تبویب القرآن کی اشاعتِ سعید پر اپنے باباجی کی خدمت میں اپنے جذباتِ قلبی کا خراج پیش کرنے کے لئے اکٹھے ہوئے ہیں۔ اس لئے ہی اگر ہم اس اجتماعِ قرآنی کو اپنی کنونشن کا خلاصہ تصور کر لیں تو یقیناً بے جا نہ ہوگا۔ آج ہم پر ربِ کریم کی رحمت کا نزول تبویب القرآن کی شکل میں ہو رہا ہے۔ میں سوچتی ہوں کہ خدا جانے اسے ہماری کونسی ایسی نیکی اتنی پسند آ گئی ہے کہ ہم خود کوئی محنت کرتے ہیں نہ تکلیف اٹھاتے۔ اس کے باوجود ہر سال قرآن کریم کے حقائق و معارف سہل ترین اور بصیرت افروز انداز لئے کتابی صورت میں ہمارے سامنے آ جاتے ہیں۔ لاریب ہمیں اپنی اس خوش بختی پر نازاں ہونے کا حق پہنچتا ہے کہ مبداءِ فیض کی کرم گستری سے ہمیں ایسا مردِ راہ داں نصیب ہوا ہے۔ اسی ذوق بے سوز کو ایسی ہستیٔ پرسوز میسر آئی ہے جس نے چالیس سال سے قرآن کریم کے انوار و اسرار کو فضا میں عام کرنے کی ذمہ داری اٹھا رکھی ہے جس کے نتیجے میں انیس[۱۹] سالوں پر محیط ہفتہ وار درسِ قرآن کے علاوہ اس دیدہ ور عاشقِ قرآن کی عمر بھر کی خارہ شگافی اور دن رات کی محنتِ شاقہ نے ہمیں کیا کچھ نہیں دیا۔ اس جویائے صراطِ مستقیم نے معارف القرآن سے شروع کر کے ہمیں تبویب القرآن تک پہنچایا ہے اور اس تابندہ و درخشندہ راستے میں کیسے کیسے انمول جواہر سے ہم نے دامن نہیں بھرا۔ ذرا پیچھے کی طرف نگاہ

ڈالیئے۔ یہاں سے وہاں تک آسمانِ دین و حکمت پر ستاروں کی طرح چمکتی ہوئی کون کونسی تصانیفِ پرویز ہمیں دعوت غور و فکر نہیں دے رہیں۔ انسان نے کیا سوچا؟ آسمانی کتابیں میں و یزداں۔ ابلیس و آدم۔ جوئے نور۔ برقِ طور۔ شعلۂ مستور۔ معراجِ انسانیت۔ نظامِ ربوبیت۔ ختمِ نبوت اور تحریکِ احمدیت۔ لغات القرآن۔ مفہوم القرآن۔ جہانِ فردا۔ کتاب التقدیر۔ سلسبیل۔ شاہکارِ رسالت۔ اقبال اور قرآن۔ مطالب الفرقان اور (ISLAM A CHALLENGE TO RELIGION) طلوعِ اسلام کے ہزاروں صفحات۔ کس کس کا نام لوں۔ اس مردِ حق شناس کی یہ تحریریں نہ صرف امتِ مسلمہ کے لئے بلکہ ساری دنیا کے انسانیت کے لئے گنج ہائے گراں مایہ ہیں۔ پرویز کی فکرِ قرآنی اور بصیرتِ قرآنی کا نچوڑ ہیں۔ حیاتِ دنیوی و اخروی میں کامرانی حاصل کرنے کی راہ دکھاتا ہے اور کسی پہلو سے بھی ہمارے لئے تشنگی باقی نہیں چھوڑتا۔ خدائے ذوالجلال کا یہ احسانِ عظیم ہے کہ مجھ جیسے متلاشی کو بھی یہ سب کتابیں پڑھنے اور ان پر غور و فکر کرکے استفادہ کی سعادت ارزانی ہوئی۔ اور اس کے بعد مجھے علی الاعلان یہ کہنے میں ذرا بھی تامل نہیں کہ زمانہ حاضرہ میں خدا کی کتاب کو سمجھنے اور سمجھانے کے تعلق سے صدیوں کے بعد ہمارے اس چمن کو یہ باغباں ملا ہے جسے پرویز کہتے ہیں۔

سامعینِ کرام! یقین جانئے کہ قرآن کا یہ حیات آفریں مفہوم جو ہمیں جناب پرویز کی فہم و فراست نے سمجھایا ہمارے اس دور میں اس کا ثانی نہیں ملتا۔ یہ عقل و شعور کو اپیل کرنے والے مسلسل درس۔ یہ دل و دماغ میں اتر جانے والی باتیں۔ یہ روشن دلائل و براہین کے ساتھ حق کی وضاحت کرنے والے اسباق۔ یہ اس قدر سلجھا ہوا اندازِ بیان کہ کسی مقام پہ ذرہ بھر الجھاؤ پیدا نہیں ہوتا۔ یہ ہمارے غور و فکر کی سوئی ہوئی صلاحیتیں بیدار کرنے والی آیاتِ بینات۔ ہمارا جی چاہتا ہے کس زبان سے ادا کریں کہ قرآن حکیم کو موجودہ زمانے کی علمی سطح کے مطابق پیش کرنے کے لئے ہمیں ایسا محقق عطا کیا جس نے ہمیں بتایا کہ مذہب کیا ہوتا ہے اور دین کسے کہتے ہیں۔ اور اسلام خدا کے فرمان کے مطابق مکمل دین ہے۔ انسان کا خود ساختہ مذہب نہیں۔ وہ دین جس کا مقصود عالمگیر انسانیت کی فلاح و بہبود ہے جو انسان کی علمی و عقلی صلاحیتوں کو جلا دینے کا موجب بنتا ہے۔ جو اپنے ہر دعویٰ کو دلیل و برہان کے ساتھ پیش کرتا ہے۔ جو انسان کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لاتا ہے۔ كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ (۱۴/۱) اے رسول! ہم نے یہ کتاب تیری طرف اس لئے نازل کی ہے کہ تو اس مشعل نورانی کے ذریعے نوعِ انسان کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف لے آئے۔ قرآن کس لئے نازل ہوا اور وہ کیا چیز ہے اس کی وضاحت سورۃ یونس کی اس آیت میں بہ تمام و کمال مل جاتی ہے جس میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ۔ اے نوعِ انسان! تمہاری طرف تمہارے نشو و نما دینے والے کی جانب سے ایک ضابطۂ قوانین نازل ہوا ہے جو انسان کے تمام نفسیاتی امراض کا علاج اپنے اندر رکھتا ہے۔ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ۔ ان لوگوں کے لئے جو اس کی صداقتوں پہ یقین رکھیں، یہ سامانِ نشو و نما اور منزلِ انسانیت تک پہنچنے کی راہنمائی دیتا ہے۔ اس کے بعد فرمایا۔ قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ۔ اے رسول! ان سے کہہ دو کہ یہ خدا کا فضل و کرم ہے کہ

ایسا عدیم النظیر ضابطۂ زندگی تمہیں مل گیا ہے ورنہ تم کیا، اگر ساری دنیا کے انسان مل کر بھی کوشش کرتے تو اس جیسا ضابطہ نہ مل سکتا۔ لہٰذا فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوا۔ تمہیں چاہیئے کہ ایسی متاعِ گراں بہا کے اس طرح بے مزد و معاوضہ مل جانے پر جتنی مسرت مناؤ کم: هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ۔ انسان جو کچھ بھی جمع کرے یہ متاع اس سے کہیں زیادہ قیمتی ہے ـــــ قرآن درحقیقت خود انسان کا ترجمان ہے اور خداوند کریم فرماتا ہے کہ اس کتاب میں خود تمہارے شرف و عظمت کا راز پوشیدہ ہے۔ یہ انسان کو اس کے صحیح مقام سے آگاہ کرتا ہے اور اسے عزت و توقیر اور اکرام و تکریم کی مسند پر بٹھاتا ہے۔ قرآن زندگی کی راہوں کو روشن کرتا ہے۔ یقیناً یہ قرآن نوعِ انسان کی راہ نمائی اس راستے کی طرف کرتا ہے جو اقوم ہے سب سے زیادہ متوازن راہ ـــــ اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِيْ لِلَّتِيْ هِيَ اَقْوَمُ۔

عزیز بہنو اور بھائیو! کیا ہم اس حقیقت سے انکار کر سکتے ہیں کہ قرآنِ عزیز کی عظمت و صداقت ہمارے قلوب و اذہان میں اس وقت جاگزیں ہوئی جب ہماری باجی نے اپنی طرز کے یکتا درسوں سے ہمارے دل و دماغ کے بند دریچے کھول دیئے! انہوں نے ہمیں جس طرح ایک ایک لفظ کے معانی کے جوہر نایاب ہمیں عطا کئے ہیں کیا ہمارے لئے اس سے بڑھ کر کوئی سامانِ تسلیم ہو سکتا ہے؟ جب یوں قرآن خود اپنی تشریح آپ کرتا ہوا سامنے آجائے تو پھر کون اس کے سامنے سرِ تسلیم خم نہ کرے! لقول حکیم الامت علیہ الرحمۃ ؎

گر تو می خواہی مسلماں زیستن ۔۔۔ نیست ممکن جز بقرآں زیستن

قرآنِ حکیم انسانی زندگی کا ایک مقصد متعین کرتا ہے۔ اس مقصد کی صداقت پر یقین ایمان کہلاتا ہے اور اس مقصد کے حصول کے لئے جس قدر جدوجہد کی جائے قرآن اسے اعمالِ صالحہ کہہ کر پکارتا ہے۔ قرآن کی ساری تعلیم انہی دو اصطلاحات میں سمٹ کر آجاتی ہے۔ یعنی اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ۔ یہ جاننے کے لئے کہ ہم مسلمانوں کا مقصدِ حیات قرآن نے کیا بتایا ہے۔ اس آیۂ جلیلہ کو دیکھئے جس میں مجملاً سارا مقصد آگیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔ هُوَ الَّذِيْ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ۔ خدا وہ ہے جس نے اپنے رسول کو ضابطۂ ہدایت اور نظامِ زندگی دے کر بھیجا جو سراسر حق پر مبنی ہے۔ مقصد اس سے یہ ہے کہ یہ نظام انسانوں کے خود ساختہ تمام نظاموں پر غالب آکر رہے گا۔ خواہ یہ بات مشرکین کو کتنی ہی ناگوار کیوں نہ گزرے۔ اس ضابطۂ ہدایت انسانی کا مقام خدائے رحمٰن کے نزدیک کیا ہے؟ اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِيْمٌ۔ بے شک یہ قرآن جس نے شرف و مجد کا حامل اور نوعِ انسان کے لئے بے حد نفع رساں اور عزت بخش ہے جو خود واجب الکریم ہے اور جو اسے راہ نما بنائے اسے واجب الکریم بنا دینے کا ضامن و کفیل۔ اور یہ کہ اِنَّهٗ لَقَوْلٌ فَصْلٌ وَّمَا هُوَ بِالْهَزْلِ یقیناً قرآن ایک فیصلہ کن حقیقت ہے۔ یونہی مذاق نہیں۔

لیکن سامعینِ کرام! جس قسم کا مذاق ہماری قوم نے اسے بنا رکھا ہے اس کا تذکرہ جگر شگاف بھی ہے، اور عبرت آموز بھی۔ بغیر سوچے سمجھے اس کے الفاظ دہراتے چلے جانے سے۔ اور اس عقیدۂ خود ساختہ کو راسخ تر کئے جانے سے کہ جتنی دفعہ ناظرہ قرآن پڑھیں گے ایک ایک حرف کے عوض دس دس نیکیوں کا ثواب ملے گا۔ یعنی

الٓـمٓ کہہ دینے سے تیس نیکیاں۔ اس سے اور آگے بڑھئے۔ سونے کے تاروں سے قرآن لکھ دیجئے جنت میں سونے اور ہیروں کا جگمگاتا محل آپ کا منتظر ہے۔ ایک طرف علمبردارانِ قرآن کا یہ شعار اور دوسری طرف قرآن کا یہ اعلان۔ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ وَّقُرْاٰنٌ مُّبِيْنٌ۔ یہ ان ابدی حقیقتوں کی یاددہانی ہے جنہیں تم نے فراموش کر رکھا ہے۔ یہ ایک ضابطۂ حیات ہے جو اپنی بات کو نہایت اُبھرے اور نکھرے ہوئے انداز سے تمہارے سامنے پیش کرتا ہے۔ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ۔ تاکہ تم غور و فکر سے کام لو۔ اور سامعینِ عزیز! کیا یہ سچ نہیں کہ کلام اللہ کے مفہوم کا ایسا نکھرا اور اُبھرا ہوا دلوں میں اُتر جانے والا انداز ہمیں پرویز اور صرف پرویز نے دیا ہے۔ جو ہر درس میں ہمیں یاد دلاتے ہیں کہ قرآن کا ایک ایک لفظ غور طلب ہوتا ہے۔ قرآن کے لفظوں پر سے یونہی نہ گزر جایا کرو اس کا ہر لفظ رُک کر سوچنے اور سمجھنے کا تقاضا کرتا ہے۔ اس میرِ کارواں کی زندگی کا مشن یہ ہے کہ مسلمان قرآنِ کریم کو براہِ راست سمجھنے لگ جائیں۔ یہ سراجِ منیر، یہ جگمگاتا چراغ جو سفرِ زندگی میں ہمارا رہنما بنتا ہے۔ اس کا طریق کار کیا ہے۔

يَهْدِيْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ وَيُخْرِجُهُمْ
مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِهٖ وَيَهْدِيْهِمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (5/16)

اس ضابطۂ قوانین کے ذریعے اللہ ہر اس قوم کو جو اپنی زندگی کو قوانینِ خداوندی سے ہم آہنگ رکھے۔ سلامتی کے راستے دکھاتا ہے اور انہیں ہر قسم کے اندھیروں سے نکال کر زندگی کی چمکتی دمکتی روشنی میں لے آتا ہے اور اپنے قانون کے مطابق سیدھے اور توازن بدوش راستے کی طرف ان کی راہنمائی کر دیتا ہے تاکہ وہ رواں دواں اپنی مقصود تک پہنچ جائیں۔

لیکن ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیئے کہ قرآن کے سراجِ منیر سے مستفید ہونے کے لئے انسانی عقل و فکر کی آنکھ کا کھلا رہنا ضروری ہے کہ عقل و فکر سے کام لئے بغیر یہ جگمگاتا چراغ ہمیں کچھ فائدہ نہیں پہنچا سکتا۔

میرے قرآنی بہن بھائیو! وحیٔ خداوندی کے تحت اپنی عقل و فکر کو بروئے کار لانے کا سبق ہمارے لئے نیا تو نہیں اس کے لئے تو ہمارے مخلص و شفیق رہبر نے اپنی زندگی کا لمحہ لمحہ وقف کر رکھا ہے۔ یہ تو وہ درس ہے جس کو آج سے انیس برس پہلے، پہلی دفعہ سننے پر ہی اپنے دل و دماغ کی دنیا بدل گئی تھی۔ اس کے بعد انیس برس سے اس منفرد درس سے ارادۃً کبھی غیر حاضری نہیں ہوئی۔ کسی ناگزیر مجبوری کی بات دوسری ہے سامعینِ عزیز خدا لگتی کہئے! ہم سے بڑھ کر خوش نصیب بھی کوئی ہوگا کہ پورا قرآن اپنے واضح تر۔ دلکش تر مفہوم کے ساتھ ہمارے سینوں میں اُتر چکا ہے اور ایک دفعہ پوری طرح سمجھ لینے کے بعد دوسری دفعہ پھر یہ فیضان جاری ہے۔ ہر درس نئے نکات کا حامل۔ ہر درس نئے معارف کا گرہ کشا۔ ہمیں کبھی یہ محسوس نہیں ہوا کہ کسی فرسودہ سبق کی ریپیٹیشن ہو رہی ہو یا کسی واعظ کا وعظ ہمیں بور کر رہا ہو۔ ہاں مگر اس موقع پر دل سے یہ سوال ضرور اٹھتا ہے کہ یہ جو قانونِ مکافاتِ عمل کی مسلسل آواز ہم سنتے چلے آرہے ہیں، کیا یہ ہمارے کردار میں انقلاب پیدا کرنے کے لئے کافی نہیں؟ جہاں تک اپنی ذات کا تعلق ہے میں پورے خلوصِ دل کے ساتھ یہ کہنے کی اجازت چاہتی ہوں کہ اگر قرآن کا یہ مفہوم جو ہمارے باباجی نے ہمیں عطا کیا

میرے سامنے نہ ہوتا تو اپنے حبیبؒ زندگی کے بے وقت بچھڑ جانے کے بعد جو میرے قرآنی رفیق بھی تھے میں ایسی جیتی جاگتی زندگی بسر کرنے کے قابل کبھی نہ ہو سکتی۔ قرآن کا یہ مفہوم جو زندگی کو ایک جوئے رواں بتاتا ہے، جس میں انسان کبھی مرتا نہیں بلکہ اپنی پوشیدہ صلاحیتوں کو ابھار کر اور بروئے کار لا کر اپنی ذات کو نشو و نما دیتا ہوا میرے حبیبؒ کی طرح مسکراتا ہوا اس زندگی سے اگلی زندگی میں داخل ہو جاتا ہے۔

فَادْخُلِىْ فِىْ عِبَادِىْ وَادْخُلِىْ جَنَّتِىْ۔

آج ہمارے سامنے ایک ایسی کتاب کا تعارف ہو رہا ہے جو جناب پرویز صاحب کی مدت العمر کی کاوشوں کا ماحصل ہے۔ اور اپنی نوعیت کی وہ واحد عظیم تصنیف ہے جس کی مثال کہیں نہیں ملتی۔ پوچھنے والے پوچھتے ہیں کہ اتنا وسیع و عمیق کام تنہا ایک فرد نے کیسے کر لیا۔ جو جواب ملتا ہے اسے ہوش گوش سے سنیئے۔ یہ کہ مقصد کے ساتھ عشق ہو تو انسان سب کچھ کر سکتا ہے۔ کیونکہ اس سے، علامہ اقبال کے الفاظ میں یہ انسان کے انگارۂ خاکی میں بال و پر روح الامیں پیدا کر دیتا ہے۔

بتویب القرآن کیا شے ہے، اسے تو خود باباجی بیان فرمائیں گے لیکن اس بات کو ذہن میں رکھیئے کہ دو ہزار چار سو عنوانات لئے ہوئے (۱۵۱۲) صفحات پر پھیلی ہوئی تین جلدوں پر مشتمل یہ قرآنی حقائق کو بے نقاب کرنے والی کتاب مل جانے کے بعد بھی اگر ہم قرآنی تعلیم کو اپنانے سے گریز کرتے رہیں تو پھر یقیناً ہم اسی قابل ہیں کہ ہمارے اعمال کے لئے میزان بھی کھڑی نہ ہو! آج سے نو سال پہلے محترم ڈاکٹر عبدالودود صاحب نے ــــــ" میں نے اس درس سے کیا پایا"ــــــ کے عنوان سے اپنے تاثرات بیان کرتے ہوئے آخر میں جو دعا مانگی تھی جشنِ قرآن کریم کے اس مبارک ترین موقع پر اس دعا کی ہم نوائی میں انہی کے الفاظ میں کرتی ہوں کہ اے رب العالمین! باباجی کی چالیس سال کی سعیٔ مسلسل نے ہم سے تیرے پیغام پر عمل پیرا ہونے کا جو خاموش وعدہ لیا ہے ہم اس سے وفا کر سکیں۔ اے خدائے بزرگ و برتر! تحقیقِ علم قرآن کے جس پودے کو محترم پرویز صاحب نے لگایا ہے تو اس کی آبیاری کر تاکہ یہ ارتقائی منازل طے کرتا ہوا ایک تناور درخت بن جائے اور آنے والی نسلیں اس سے ہمیشہ ہمیشہ مستفید ہوتی رہیں۔ آمین

والسلام　　　　ثریا عندلیب

؎ خان حبیب اللہ (مرحوم) جو محترمہ ثریا عندلیب کے نہ صرف رفیقِ حیات تھے بلکہ رفیقِ منازلِ قرآنی بھی تھے۔ پاکستان ریلوے کے ایک اعلیٰ منصب پر سرفراز تھے۔ قریب دس سال ہوئے اسلام آباد میں ایک حادثہ کا شکار ہو گئے۔ رحمہ اللہ تعالیٰ۔　　(طلوع اسلام)

کوئٹہ میں ادارہ طلوع اسلام کی مطبوعات حاصل کرنے کے لئے مندرجہ ذیل پتوں پر رجوع فرمائیں۔
(۱) ہاشمی برادرز۔ جیک مشن روڈ۔　　(۲) انصاری بک سٹال۔ پرنس روڈ۔
(نمائندہ بزم طلوع اسلام۔ کوئٹہ)